دعوت دیتی ہے اور نہ مزدوروں کی اجرت میں کمی اور زیادتی کی خواہاں ہے، وہ نہ کسی سے یہ کہتی ہے کہ تم اپنی پیداوار کا ایک بڑا حصّہ برباد کردو تاکہ جنس کی کمی سے مانگ بڑھ جائے اور تمہیں زیادہ سے زیادہ قیمت مل سکے اور نہ کسی دولتمند سے یہ تقاضا کرتی ہے کہ وہ اپنے مال کو سود پر اٹھا کر اسے دس گنا بنالے۔ اس کا مطلب نہ یہ ہے کہ ثروت و دولت کا مالک بازار کا تمام سامان خرید کر ذخیرہ اندوزی کرے اور نہ یہ مقصد ہے کہ نئے نئے بازار کھولنے کے لئے غیر ممالک پر ڈورے ڈالے جائیں اور ان کے سکون و اطمینان کو خطرہ میں ڈالا جائے۔

ان تمام باتوں کا سرچشمہ شخصی ملکیت نہیں ہے بلکہ وہ مادی فلسفہ ہے جس میں ہر ایک کو اپنی ہی فکر ہوتی ہے ہر انسان کو مکمل آزادی ہوتی ہے نہ کوئی اخلاقی نظام ہوتا ہے نہ روحانی جذبہ۔ ظاہر ہے کہ ایسے خود غرض اور مادیت پرست نظام کے زیر سایہ پرورش پانے والے ذہن سے ان مظالم کے علاوہ توقع ہی کیا کی جا سکتی ہے، یہ نظام ہی ایسا ہے جس میں ان لعنتوں اور شقاوتوں کا ہونا ضروری ہے اور یہ دستور ہی ایسا ہے جس میں انسانیت کو مظلومیت کی زندگی گذارنا پڑے گی۔ اور جب یہ طے ہو گیا کہ فسادات کا سرچشمہ انفرادی ملکیت نہیں ہے بلکہ مادیت پرستی ہے تو یہ بھی معلوم ہو گیا کہ انسانی مسئلے کا حل انفرادی ملکیت کے قانون میں تبدیلی نہیں ہے بلکہ اس کا صحیح حل یہ ہے کہ مادیت کے نظام کو بدل کر اس کی جگہ روحانیت رکھی جائے اور خود غرضی کو ایثار و قربانی اور اخلاقی اقدار سے بدل دیا جائے۔

مسئلہ کی صحیح توجیہ

اسلام اور اجتماعی مشکل

اجتماعی مشکل کے حل کی پہلی کڑی تک پہونچنے کے لئے اس سوال کا اٹھانا ضروری ہے کہ وہ کون سے اسباب ہیں جن کی بنیاد پر سرمایہ داری نے ذاتی منفعت اور شخصی مصلحت کو معیار و مقیاس اور ہدف و غایت قرار دیا ہے؟ وہ کونسی فکر ہے جس کی وجہ سے معاشرہ اتنی عظیم مصیبت میں گرفتار ہو گیا ہے اور سرمایہ داری انسانی فلاح و بہبود کے میدان میں ناکام رہی ہے؟ اسی فکر کو باطل کرنے کے بعد ہم معاشرہ کی تباہی کی ہر بنیاد کو منہدم کر سکتے ہیں اور انسانیت کے خلاف ہونے والی ہر سازش کو ناکام بنا سکتے ہیں، تاکہ ذاتی مصلحت انسانی مفاد کا ذریعہ بنے اور انفرادی ملکیت سے صنعتی پیداوار کا صحیح کام لیا جا سکے۔

درحقیقت یہ بنیادی فکر مغرب کی وہ مادیت ہے جس میں وہ سر سے پیر تک ڈوبا ہوا ہے اور جس کے قلعہ کو وہ مسلسل مستحکم بنا رہا ہے اس لئے کہ جب انسان کے پیش نظر اپنی ہی مصلحت ہوگی اور ہر شخص اپنی ہی حیات کے بارے میں سوچے گا، تسخیر کائنات و تفسیر حیات میں مکمل آزادی ہوگی، زندگی کا مقصود صرف مادی لذتوں کا حاصل کرنا ہوگا، حب نفس کا جذبہ سر اٹھائے گا تو وہ تمام برائیاں منظر عام پر آجائیں گی جن سے سرمایہ داری دوچار ہوئی ہے اور جو آج اس کا شاہکار بنی ہوئی ہیں۔

جب نفس انسانی فطرت کا وہ عمیق جذبہ ہے جس سے زیادہ ہمہ گیر کوئی جذبہ نہیں ہے۔ دنیا کے سارے جذبات اور نفس کے جملہ خواہشات اسی ایک

جذبے کے فروع ہیں، معاشیات میں بھی یہی جذبہ کارفرما رہتا ہے۔ انسان جب اپنے نفس کو عزیز رکھتا ہے تو اس کی کوشش ہوتی ہے کہ اپنے آرام کا ہر سامان مہیا کرے اور اپنی تکلیف کے ہر وسیلے کا خاتمہ کرے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ کسب معاش شروع کرتا ہے، غذائی اسباب مہیا کرتا ہے اور راحت کے لئے ہر تکلیف برداشت کرتا ہے اور جب یہ دیکھ لیتا ہے کہ موت کی مصیبت زندگی کی دشواریوں سے زیادہ آسان ہے تو موت کو حیات پر ترجیح دیتا ہے اور اس طرح خودکشی واقع ہو جاتی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کی پوری زندگی کے پس منظر میں ایک ہی جذبہ کارفرما رہتا ہے جس کا نام ہے حب نفس اور جس کی تعبیریں ہیں حب لذت و بغض الم ــــــ انسان کو کسی وقت اس بات پر مجبور نہیں کیا جا سکتا کہ وہ دوسروں کے آرام کے لئے خود تکلیف برداشت کرے ان کی لذت کے لئے اپنے الم کو اختیار کرے یہاں تک کہ اس سے اس کی فطرت کو سلب کر لیا جائے اور اسے دوسری خلقت دیکر لذتوں کا دشمن اور آلام کا دوست بنا دیا جائے۔

آپ انسانی تاریخ میں جن ایثاروں اور قربانیوں کا تذکرہ سنتے ہیں درحقیقت ان کی پشت پر بھی یہی جذبہ رہا ہے۔ انسان نے اپنے بھائی، اولاد اور دوستوں پر جان قربان کی ہے۔ اخلاقی اقدار اور روحانی مثالوں کی خاطر مصائب برداشت کئے ہیں لیکن ان سب نے اپنے واسطے ایک لذت فرض کر لی ہے اور یہ طے کر لیا ہے کہ اس ایثار سے جو فائدہ ملنے والا ہے وہ قربانی و ایثار سے کہیں زیادہ لذت بخش ہے۔ یہی وہ فلسفہ ہے جس کی روشنی میں انسان کی پوری زندگی کی تفسیر کی جا سکتی ہے اور اس کے ہر عمل و اقدام کی توجیہ ممکن ہے چاہے وہ اپنے لئے ہو یا غیر کے لئے۔۔۔ انسان میں لذت حاصل کرنے کی مختلف صلاحیتیں پائی جاتی ہیں اور اس کی لذتیں بھی چند طرح کی ہوتی ہیں۔ ایک مادی لذت ہوتی ہے جس کا تعلق عمدہ غذا،

خوشنما لباس اور بہترین جنسی تسکین سے ہے اور ایک معنوی لذت ہے جس کا تعلق اخلاقی اقدار، روحانی افکار اور مذہبی عقائد سے ہے، انسان ان افکار و عقائد کو بھی اپنی زندگی کا ایک جزو سمجھتا ہے اس لئے ان سے بھی ایک لذت محسوس کرتا ہے، اب جیسا انسان ہوگا جیسی اس کی صلاحیت و تربیت ہوگی ویسی ہی اس کی لذت و راحت بھی ہوگی، بعض صلاحیتیں ایسی ہوتی ہیں جو فطری طور پر ایک دن پختہ ہو جاتی ہیں جیسے جنسی صلاحیت کہ وہ جوانی میں خود بخود کامل ہو جاتی ہے اور انسان کو لذت اندوزی پر آمادہ کرتی ہے اور بعض صلاحیتیں تربیت کی منتظر رہتی ہیں ان کا اظہار اس وقت تک نہیں ہوتا جب تک کہ صحیح تربیت اور مناسب ماحول شامل حال نہ ہو جائے ۔۔۔ یہی وجہ ہے کہ ایک انسان دوسرے کو بھوکا دیکھ کر بھی اپنے ہی کو مقدم کرتا ہے اور دوسرا انسان خود بھوکا رہ کر دوسرے کو سیر و سیراب کر دیتا ہے اور فرق یہی ہوتا ہے کہ پہلے انسان کو صحیح تربیت نہیں مل سکی تو اس کے اخلاقی روحانی جذبات خوابیدہ رہ گئے انھیں بیدار ہونے کا موقع نہیں مل سکا اور دوسرے کو یہ پاکیزہ تربیت میسر آگئی تو اس کی تمام صلاحیتیں بروئے کار آگئیں اسے اخلاقی اور جذباتی افکار سے لذت بھی محسوس ہونے لگی اور اس میں خوئے ایثار بھی پیدا ہو گئی۔

ظاہر ہے کہ جب حب نفس کا جذبہ اتنی گہرائیاں رکھتا ہے اور انسان نفس کو فقط مادی طاقت محسوس کرتا ہے تو اس کا لازمہ یہ ہوگا کہ وہ صرف ان اسباب کے مہیا کرنے کی کوشش کرے گا جن سے مادی راحت و لذت مل سکے اس کے کسب کا دائرہ بھی محدود ہوگا اور اس کی غرض و غایت بھی اپنے ہی دائرہ تک رہے گی وہ تھوڑی سی لذت پر راضی ہو جائے گا اور معمولی راحت کو اپنے لئے بہت کچھ سمجھے گا ۔۔۔ اس کی نظر میں سب سے زیادہ قیمتی شے مال ہوگی اس لئے کہ

وہی ہر لذت مادی کا ذریعہ، اور سکون وقتی کا وسیلہ ہے اور یہی چیز وہ ہوگی جو ایک دن اسے سرمایہ دارانہ ذہنیت میں تبدیل کردے گی اور اس کے پیش نظر صرف اپنی مادی ذات ہوگی اور بس!

اب آپ فرمائیں کہ ان مادی افکار و نظریات کے ہوتے ہوئے کیا صرف انفرادی ملکیت کو ختم کردینے سے معاشرہ کی اصلاح ہوسکتی ہے اور سماج ان تمام بلاؤں سے نجات پاسکتا ہے؟ ہرگز نہیں، معاشرہ کی خوشحالی اس بات پر موقوف ہے کہ ذمہ دار افراد اپنے طریق سے عدول نہ کریں اور ان کا مقصد صرف اصلاحی ہو۔ حالانکہ سرمایہ دار مادیت میں اس کا کوئی امکان نہیں ہے۔ یہاں ذمہ دار افراد کے ذہنوں پر بھی حیات کا وہی مادی تصور مسلط ہے جسے سرمایہ داری نے بنیاد قرار دیا ہے۔ فرق یہ ہے کہ ان لوگوں نے اسے فلسفی سانچے میں ڈھال دیا ہے، اور اس کے لئے خوبصورت الفاظ کا انتخاب کرلیا ہے۔

سوچنے کی بات ہے کہ اگر کسی موقع پر حکام کے پیش نظر دو راستے ہو جائیں ایک میں اپنا ذاتی فائدہ اور اپنی مصلحت ہو چاہے دوسروں کا نقصان ہی کیوں نہ ہو جائے اور دوسرے میں دوسرے کا عمومی فائدہ ہو چاہے اپنا نقصان ہی کیوں نہ ہو تو ایسے موقع پر مادہ پرست حکام کس راستے کو اختیار کرینگے اور ان کا طرز عمل کیا ہوگا؟ ظاہر ہے کہ وہ انفرادی فائدے کو اجتماعی مفاد پر مقدم کریں گے اور اس کا سبب صرف شخصی ملکیت کا قانون نہیں ہے کہ اسے مہمل قرار دے کر اس خود غرضی کا علاج کرلیا جائے بلکہ اس کے دوسرے اسباب بھی ہیں جن کا ظہور مختلف شکلوں میں ہوا کرتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اب اشتراکی ممالک میں بھی خیانت کے مجرم تخت حکومت سے اتارے جانے لگے ہیں حالانکہ وہاں شخصی ملکیت کا کوئی تصور نہیں ہے۔

سرمایہ داری اور اشتراکیت میں فرق یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام
آزادی وحریت کے نتیجہ میں جمع ہونے والی دولت اشتراکی ملک میں اس ایک جما
کے حوالے کردی جاتی ہے جو حکومت کی نمائندگی اور ملک کا انتظام کرتی ہے ۔
ہے کہ اس جماعت کے عقائد و افکار بھی وہی ہوتے ہیں جو سرمایہ داری کے
حیات کا مادی مفہوم اُنکے ذہنوں میں بھی تھا ان کے ذہنوں میں بھی ہے، جب
جذبہ انکے دل میں بھی تھا ان کے دل میں بھی ہے، ذاتی مصالح کو مقدم رکھنے کی
ان کے نفس میں بھی تھی ان کے نفس میں بھی ہے، اخلاقی اقدار اور روحانی افک
وہ بھی منکر تھے اور یہ بھی منکر ہیں۔ توکیا ان سے اسی خطرہ کا اندیشہ نہیں ہے
اب تک انسانیت دوچار تھی اور کیا یہ سماج کو اسی طرح تباہ وبرباد نہ کریں
جس طرح اب تک کے لوگ کر رہے تھے؟ حقیقت یہ ہے کہ یہ سب کچھ ہوگا
کہ بنیادی خطرہ حیات کا مادی مفہوم ہے اور وہ دونوں کے ذہنوں میں مشت
طور پر پایا جاتا ہے، دولت کو ایک مرکز پر جمع کر کے ایک ایسی حکمراں جماعت
حوالے کردینا جس کے ذہن کی تشکیل جدید نہ ہوئی ہو انتہائی خطرہ رکھتی ہے ج
خطرہ ان سرمایہ داروں سے تھا جن کے پاس یہ دولت بٹی ہوئی تھی ۔ ہاں
فرق ضرور ہے کہ سرمایہ دار لوگ خود ان اموال کے مالک تھے اور ان کے فوائ
منافع سے بہرہ اندوز ہوتے تھے اور یہ بیچارے حکام قانونی طور پر نہ ملکی
کے مالک کہے جاتے ہیں اور نہ انھیں اس کے استعمال کرنے کا حق ہے ۔ یہ اور
ہے کہ نفس وہی نفس ہے اور فلسفہ وہی فلسفہ، مفاد پرستی اسی انداز کی ہے
فلسفیانہ نظام بعینہ وہی ۔

مشکل کا صحیح حل

ایسے حالات میں عالم انسانیت کے سامنے دو ہی راستے ہیں۔ ایک یہ کہ انسان کی فطرت میں تبدیلی کر کے اسے دوسرے قلب و دماغ، دوسرے ذہن و مزاج اور دوسرے جذبات و احساسات کا انسان بنا دیا جائے۔ ایسے جذبات جہاں ذاتی منفعت کا خیال نہ ہو، شخصی مفاد بے قیمت ہو، سماج پر قربان ہو جانا عین سعادت ہو اور پھر حیات کا مفہوم وہی مادی مفہوم ہو، زندگی اسی چند روزہ لذت و راحت کا نام ہو، ظاہر ہے کہ یہ بات اسی وقت ممکن ہے جب انسان کے دل کی گہرائیوں سے حب نفس کا جذبہ نکال لیا جائے یا اسے حب جماعت سے بدل دیا جائے تاکہ اب ایسے انسان پیدا ہوں جنھیں اپنی ذات سے دلچسپی نہ ہو، اپنی منفعت سے سروکار نہ ہو وہ صرف سماج کی خدمت کرنا جانتے ہوں اور سماج پر قربان ہونا چاہتے ہوں۔

دوسرا راستہ یہ ہے کہ حیات کا مادی تصور بدل دیا جائے اور انسان کو مادیت سے بلند و بالا بنا دیا جائے تاکہ اس طرح اس کے مقاصد و اغراض، افکار و اقدار سب میں تغیر پیدا ہو جائے اور معاشرے کی اصلاح کا معجزہ آسانی کے ساتھ وقوع پذیر ہو جائے۔

پہلا خواب وہ ہے جسے اشتراکیت کے پرستار مسلسل دیکھتے رہے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ مستقبل میں یہ خواب شرمندۂ تعبیر ہو جائے گا جب انسان کی ایک نشاۃ ثانیہ ہوگی اور اس کے جذبات عوامی مفاد کی تحصیل کی طرف مڑ جائینگے مصلحت پرستی کا خاتمہ ہو جائیگا اور ہر شخص اجتماع کا خادم ہوگا لیکن اسکے لئے

ضروری ہے کہ عالم کی قیادت اشتراکی حکام کے حوالے کر دی جائے تاکہ وہ ایک ماہر ڈاکٹر کی طرح انسانی نفسیات کا علاج کریں، فاسد اجزاء کو الگ کر دیں اور ٹیڑھے اعضاء کو سیدھا کر دیں۔ لیکن اب یہ کام کتنے عرصے میں مکمل ہو سکے گا اس کا کوئی صحیح اندازہ نہیں ہے۔ یہ اور بات ہے کہ دنیا کا ایک ایسے نظام کی طرف بھی مائل ہونا اس بات کا زندہ ثبوت ہے کہ دنیا سرمایہ داری کے مظالم سے عاجز آچکی ہے اور اس میں پُرفریب نعروں کی برداشت کی قوت باقی نہیں رہ گئی ہے، اس نے انسان سے اس کی شرافت کو سلب کر لیا ہے اور معاشرہ کا خون چوس کر چند سرمایہ داروں کے پیالوں میں بھر دیا ہے۔

انسان کی نشاۃ ثانیہ کا بنیادی خیال مارکسیت کی حب نفس کے بارے میں منفرد رائے ہے۔ یہ لوگ جذبہ حب نفس کو انسان کا فطری جذبہ نہیں سمجھتے بلکہ ان کا خیال ہے کہ یہ جذبہ حالات کی پیداوار ہے۔ انسان ایک مدت دراز سے ایسے ماحول سے دوچار رہا ہے جس میں شخصی ملکیت کے اصول کارفرما رہے ہیں اس لئے اس میں یہ جذبہ پیدا ہو گیا ہے اور وہ اپنے نفس سے محبت کرنے لگا ہے اب اگر کوئی ایسا انقلاب رونما ہو جائے جہاں انفرادی ملکیت ختم ہو جائے اور اس کی جگہ اجتماعی ملکیت کو مل جائے تو انسانی نفسیات بالکل منقلب ہو جائیں گے اور اس کے دل میں حب نفس کے بجائے حب معاشرہ کا جذبہ پیدا ہو جائے گا۔ وہ اپنے فائدہ کے بجائے عوامی مفاد کے بارے میں سوچنے لگے گا اور زمانہ کی حالت میں عظیم تغیر رونما ہو جائے گا —— لیکن حقیقت یہ ہے کہ جذبہ حب نفس کی یہ تفسیر انسانی کیفیت کی اُلٹی ترجمانی ہے اور جذبہ کو سماج کی پیداوار قرار دینا عقلی و منطق کی صریحی مخالفت ہے۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ انسان کے نفسانی جذبہ کو شخصی ملکیت والے ماحول کا نتیجہ قرار دیدیا جائے جبکہ

دیکھا یہ جا رہا ہے کہ شخصی ملکیت کا قانون ہی اسی جذبہ کی پیداوار ہے انسان میں اگر اپنے نفس سے محبت کا جذبہ نہ ہوتا تو وہ کبھی شخصی ملکیت یا ذاتی منفعت کے بارے میں نہ سوچتا، یہ فکر خود ہی دلیل ہے کہ وہ اپنے اندر ایک ایسے جذبے کو چھپائے ہوئے ہے جو اسے ایسے اقدامات پر آمادہ کر رہا ہے اور اپنا نقصان کر کے سماج کو فائدہ پہونچانے کی طرف مائل نہیں ہونے دیتا۔ ایسے حالات میں انفرادی ملکیت کا خاتمہ کر دینا سماج کی اصلاح نہیں کر سکتا بلکہ ضرورت اس اس دل کے چور کو ختم کرنے کی ہے جو بہر حال اپنا کام کرتا رہے گا چاہے انفرادی ملکیت کا قانون ختم ہی کیوں نہ ہو جائے۔

علاوہ اس کے اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ نفسیاتی جذبہ سماجی حالات کی پیداوار ہے تو اتنا تو بہر حال ماننا پڑے گا کہ شخصی ملکیت کے خاتمہ سے یہ جذبہ ختم نہیں ہو سکتا بلکہ اس کے لئے سماج سے ان تمام مظاہر کو ختم کرنا پڑیگا جن میں شخصیت کی جھلک پائی جاتی ہو اور انفرادیت کی بو آتی ہو اور انھیں مظاہر میں سے ایک "خصوصی انتظام" کا مسئلہ ہے جس کا وجود اشتراکی نظام میں بھی پایا جاتا ہے۔ اشتراکیت میں ملکی دولت کا انتظام پورے معاشرہ کے حوالے نہیں کیا گیا بلکہ چند مخصوص افراد کے سپرد کر دیا گیا ہے کہ وہ اپنی عقل و فکر کے مطابق اس کا انتظام کریں۔ ظاہر ہے کہ یہ انتظامات کی خودرائی اور انانیت انسان کے اندر اس جذبہ کو بیدار کرتی رہے گی جس کے خاتمہ کے لئے شخصی ملکیت کو ختم کرنے کا قانون وضع کیا گیا تھا۔

معلوم یہ ہوا کہ انسانی مشکل کو حل کرنے کا پہلا طریقہ وہ خواب ہے جو کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا نہ انسان بدلا جا سکتا ہے اور نہ اس کے جذبات کا خاتمہ ہو سکتا ہے شخصی ملکیت رہے یا نہ رہے۔ دوسرا حل وہ ہے جسے اسلام نے پیش کیا ہے اس کا

دعویٰ ہے کہ انسانی مشکلات کا حل صرف یہ ہے اس کی مادی تفسیر اور زندگی کی مادی تعبیر کو ختم کر دیا جائے۔ انسان کو اخلاقی اقدار اور روحانی افکار کا خوگر بنایا جائے تاکہ اس طرح مقام عمل میں وہ خود ہی اجتماع پرست ہو جائے اور یہی وجہ ہے کہ اس نے اپنی اصلاح و تعمیر کا آغاز شخصی ملکیت کے خاتمے سے نہیں کیا بلکہ اپنی پوری قوت اس بات پر صرف کر دی کہ حیات کا موجودہ مفہوم بدل کر اس کی جگہ ایک نیا مفہوم رکھا جائے۔ وہ مفہوم جس میں نہ فرد سماج کا میکانیکل آلہ ہو اور نہ سماج فرد کی گردن پر بار گراں ہو بلکہ دونوں کے الگ الگ حقوق ہوں اور ہر ایک کے حق کا تحفظ کیا جائے۔ انسان کی مادی اور معنوی دونوں قسم کی بزرگی کا لحاظ رکھا جائے۔

اسلام نے اس طرز فکر سے سماج کی اس دکھتی ہوئی رگ پر ہاتھ رکھا ہے جو ہر برائی کی جڑ اور ہر تباہی کی اصل تھی اس نے دیکھا کہ مرض کی وہ جڑ جس نے سارے عالم کو تباہ کر رکھا ہے اور جس سے انسانیت کی پوری دنیا نالان و فریاد کناں ہے وہ حیات کا مادی مفہوم ہے جس میں ہر شخص مفاد پرست اور خود غرض ہے۔ ہر ایک کے پیش نظر چند روزہ زندگی اور غیر دائمی لذت و راحت ہے، جو ہے وہ اپنی ذاتی مصلحت کو معیار زندگی بنائے ہوئے ہے اور اسی کے لئے جدو جہد کر رہا ہے۔

سرمایہ داری اسلام کی نظر میں ناپائیدار نظام کا نام ہے لیکن اس لئے نہیں کہ اس میں شخصی ملکیت کا اعتراف کیا گیا ہے جیسا کہ اشتراکیت کا خیال و عقیدہ ہے بلکہ اس لئے کہ اس کی بنیاد ایک مادی فلسفہ پر ہے جس کے بعد خود غرضی اور مصلحت پرستی ضروری ہو جاتی ہے اس کی نظر میں نورانی زندگی اور روشن مستقبل کی تعمیر کے لئے اس مفہوم کا بدلنا انتہائی ضروری ہے وہ حیات کو نیا مفہوم دینا چاہتا ہے، سیاست کو نئی راہوں پر چلانا چاہتا ہے۔ عالمی مسائل کو نئے زاویہ نگاہ سے دیکھنا چاہتا ہے اور یہی اس کا حقیقی پیغام ہے جسے اس نے صبح قیامت تک کے لئے پیش کیا ہے اور جس کے

اصول وقوانین حیات وکائنات کے جدید مفہوم سے حاصل کئے گئے ہیں۔ اسلام نے حیات کے مفہوم میں یہ تازگی پیدا کی کہ انسانی زندگی ایک لامحدود زندگی کے فیض کرم کا نتیجہ ہے اور وہ ایک دن ایک ایسے عالم کیطرف منتقل ہوجائیگی جہاں نہ دکھ درد ہوگا نہ رنج ومصیبت ـــــ اس کے اعمال وافعال، کردار ورفتار کا ایک مکمل معیار ہے اور وہ ہے رضائے الٰہی ـــــ اب نہ ہر مفید ومنفعت بخش حلال ہے اور نہ ہر مضرو نقصان دہ حرام ـــــ بلکہ معیار رضائے الٰہی ہے جس عمل سے جس قدر رضائے الٰہی حاصل ہوسکے وہ اتناہی مستحسن اور جو جس قدر رضائے الٰہی سے دور کرسکے وہ اتناہی قبیح وشر ـــــ صحیح انسان وہ ہے جو اس ہدف کو پیش نظر رکھے اور سچا مسلمان وہ ہے جو اس مقصد کو حاصل کرکے اپنی پوری زندگی اسی کے سانچے میں ڈھال دے۔

حیات وانسانیت کے مفاہیم میں یہ زبردست تغیر انسان کو ایک نیا وجود نہیں دینا چاہتا اور نہ اشتراکیت کی طرح اس کے گہرے جذبات کو سلب کرنا چاہتا ہے اس لئے کہ یہ جذبات فطری ہیں اور ان کا سلب کرنا ناممکن ہے بلکہ تجربہ شاہد ہے کہ پوری تاریخ انسانیت میں اس جذبہ سے زیادہ کسی جذبے نے کام نہیں کیا ہے یہ جذبہ نہ ہوتا تو پہلا ہی انسان اپنی ضروریات کی فکر نہ کرتا اور اس طرح آئندہ نسل بھی وجود میں نہ آسکتی، یہی ضرورتیں تھیں جنھوں نے معاشرے کو جنم دیا اور انسانی تعلقات کو عام کیا لہٰذا ان کا انکار ناممکن ہے ـــــ ضرورت ایک ایسے نظام کی ہے جو ان جذبات کی قدر بھی کرتا ہو، انسان میں تغیر کو ناممکن بھی سمجھتا ہو اور انسانیت کی اس مشکل کو حل بھی کردے۔

اسلام ایک ایسا ہی پیغام دینا چاہتا ہے جس میں ان دونوں باتوں کا لحاظ رکھا گیا ہو، حب نفس کا فطری جذبہ بھی زندہ وبیدار رہے اور وہ اخلاقی اقدار بھی عام ہوجائیں جنھیں انسانی فلاح کے لئے وضع کیا گیا ہے، بظاہر یہ دونوں باتیں متضاد ہیں

اس لئے کہ حب نفس کا تقاضا ہے کہ انسان صرف اپنے فائدے کے بارے میں سوچے اور اپنی مصلحت کے لئے قدم اٹھائے اور اخلاقی اقدار کا مطالبہ ہے کہ سماج کی خدمت کیجائے، معاشرے کو فائدہ پہونچا دیا جائے چاہے اپنا نقصان ہی کیوں نہ ہو جائے لیکن اسلام کا کارنامہ تھا کہ اس نے ان دونوں متضاد عناصر کو ایک محل پر جمع کر دیا اور انسان کے مختلف جذبات میں وحدت پیدا کر دی، اس سلسلے میں اس نے دو طریقے اختیار کئے ہیں ــــ!

۱۔ حیات کی وہ سچی تصویر کشی کی جس میں زندگی آخرت کا پیش خیمہ بن گئی، دنیا کشت آخرت نظر آنے لگی۔ انسان کو یہ محسوس ہونے لگا کہ اس دنیا کے بعد بھی ایک عالم ہے جہاں یہاں کے اعمال کی جزا ملے گی اور جو جس قدر رضائے الٰہی کا حامل ہوگا اسی قدر سکون و اطمینان کا حقدار بھی ہوگا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شخصی منفعت ہی اجتماعی فائدے کی بنیاد بن گئی اور انسان سماج کی خاطر یہ سوچ کر قربانیاں پیش کرنے لگا کہ یہ قربانیاں رائیگاں نہ جائیں گی بلکہ ان کے عوض میں دوسرے عالم میں اس سے کہیں زیادہ مل جائے گا ــــ ظاہر ہے کہ آدمی کام کر رہا تھا اس اُخروی اجر کی لالچ میں جو حب نفس کا تقاضا تھا اور اسکے ضمن میں پوری ہو رہی تھی معاشرے کی خدمت جو اس فکری انقلاب کا مقصود و مطلوب تھی۔

حیات کی اس جامع تفسیر نے جماعت کے مسئلے کو فرد کا مسئلہ بنا دیا اور انسان کو سماج کی خدمت پر مجبور کر دیا حالانکہ کھلی ہوئی بات ہے کہ اگر یہ آخرت کا تصور نہ ہوتا اور حیات صرف مادی حیات رہتی تو ایسا کچھ نہ ہو سکتا اور انسان صرف اسی دنیا کی لذت و راحت کے بارے میں سوچتا رہ جاتا، اس کے سامنے یہیں کا فائدہ ہوتا اور یہیں کا نقصان ــــ اسلام نے اپنے ان افکار کو متعدد قرآنی آیات میں ظاہر کیا ہے جن کا ایک خاکہ یہ ہے "من عمل صالحًا فلنفسہ ومن اساء فعلیہا" ــــ

جو انسان نیک کام کرے گا وہ اسی کے کام آئیگا اور اگر برائی کریگا تو وہ بھی اسی کے سامنے آئے گی ــــ "من عمل صالحا من ذکر او انثیٰ وھو مومن فاولئک یدخلون الجنۃ یرزقون فیھا بغیر حساب" جو شخص بھی کوئی عمل خیر کریگا چاہے وہ مرد ہو یا عورت اُسے جنت میں بے حساب رزق دیا جائیگا بشرطیکہ صاحب ایمان بھی ہو ــــ "یومئذ یصدر الناس اشتاتا لیروا اعمالھم فمن یعمل مثقال ذرۃ خیر ایرہ ومن یعمل مثقال ذرۃ شرا یرہ" آج لوگ متفرق طور پر اس لئے اٹھائے جائیں گے تاکہ انھیں ان کے اعمال دکھائے جائیں اب جس نے ذرّہ برابر خیر کیا ہے وہ بھی دیکھے گا اور جس نے ذرّہ برابر برائی کی ہے وہ بھی دیکھے گا ــــ "ذالک بانھم لا یصیبھم ظمأ ولا نصب ولا مخمصۃ فی سبیل اللہ ولا یطئون موطئا یغیظ الکفار ولا ینالون من عدو نیلا الا کتب لھم بہ عمل صالح ان اللہ لا یضیع اجر المحسنین و لا ینفقون نفقۃ صغیرۃ ولا کبیرۃ ولا یقطعون وادیا الا کتب لھم لیجزیھم احسن ما کانوا یعلمون" یہ اسلئے کہ مسلمانوں کو کوئی بھوک پیاس یا دشواری و تعب راہ خدا میں ایسی نہ ہوگی جس کا اجر نہ ملے انھیں ہر ہر قدم پر اجر ملے گا اور ہر ہر درد و رنج کا معاوضہ دیا جائیگا خدا کسی کے اجر کو ضائع نہیں کرتا، یہ لوگ کوئی چھوٹا بڑا خرچ کریں گے تو وہ بھی اور اگر کوئی وادی طے کریں گے تو وہ بھی سب لکھ لیا جائے گا اور انھیں ان کے عمل سے بہتر اجر دیا جائے گا۔

۲۔ اخلاق کی ایسی تربیت کی جس میں روحانی غذا کا انتظام ہو اور انسانی جذبات و احساسات کو ایک خاص سانچے میں ڈھالا جاسکے اس لئے کہ انسان کے اندر چند مختلف رجحانات و میلانات پائے جاتے ہیں۔ بعض کا تعلق مادیات سے ہے جن کی خواہش

فطری طور پر ظاہر ہوتی ہے جیسے کھانے پینے اور جنسی لذت حاصل کا رجحان ہے اور بعض کا تعلق روحانیت سے ہے جن کا ظہور تعلیم و تربیت و نگرانی کا محتاج ہے اور یہی وجہ ہے کہ انسان جب بے تربیت رہ جاتا ہے تو اس پر مادی خواہشات کا غلبہ ہو جاتا ہے اور معنوی رجحانات پردۂ خفا ہی میں رہ جاتے ہیں ـــــ دین چونکہ ایک معصوم قیادت کا علمبردار ہوتا ہے اس لئے وہ اخلاقی تربیت کو اسی معصوم قیادت کے حوالے کر دیتا ہے اور اس قیادت کے زیر سایہ ایسے احساسات و جذبات کی پیداوار ہوتی ہے جن کے بعد انسان اخلاقی اقدار اور انسانی کردار کے اپنانے پر فطرتاً مجبور ہو جاتا ہے ذاتی منافع کا تصور محو ہو جاتا ہے اور اجتماعی مفاد زندگی کا مطمح نظر بن جاتا ہے ـــــ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ نفس سے حب ذات کا جذبہ محو ہو جاتا ہے اور انسان نشاۃ ثانیہ کی منزل میں آجاتا ہے بلکہ یہ اخلاق و کردار خود حب ذات کی تفسیر بن جاتا ہے اور انسانی اجتماعی مفاد کے مقدم رکھنے ہی کو اپنے نفس سے سچی محبت خیال کرتا ہے۔ اب اخلاقی قدریں اس کی ذاتی لذت کا سبب ہوتی ہیں اور اجتماعی مفاد اس کے نفس کی تسکین کا باعث ہوتا ہے۔

اسلام نے انھیں دو طریقوں سے افراد کے مسئلے کو اخلاق کا مسئلہ اور ذات کے مسئلے کو جماعت کا مسئلہ بنایا ہے ایک طریقہ کا نچوڑ انسان کو حیات کی صحیح تصویر دکھلانا اور اس کو زندگی کے آغاز و انجام سے روشناس کرانا ہے تاکہ وہ اخلاقی قدروں کے احترام پر آمادہ ہو سکے اور اجتماعی مفادات کا خیال کر سکے اور دوسرے کا ماحصل اخلاقی تربیت ہے جس میں جذبات و احساسات کی نئی تشکیل ہو اور انسان جماعت کے مسئلے کو فرد کا مسئلہ سمجھنے لگے۔ ہم نے انھیں دونوں طریقوں کا نام "حیات کا معنوی تصور" اور "زندگی کا اخلاقی احساس" قرار دیا ہے۔

"معنوی تصور" اور "اخلاقی احساس" ہی وہ اہم بنیادیں ہیں جن پر اسلام کے

جامع معیار کی تعبیر کی گئی ہے اور اسلام نے اس جامع اور ہمہ گیر معیار کا نام رضائے الٰہی رکھا ہے یہی رضائے الٰہی اسلامی زندگی کا صحیح معیار اور انسانی سفینے کو ساحل مراد تک پہونچانے کا واحد ذریعہ ہے۔

اسلام نے اپنی تشکیلات میں فرد و اجتماع دونوں کو ایک نظر سے دیکھا ہے اس کا مقصد فرد و معاشرے کے درمیان صحیح توازن قائم کرنا ہے۔ وہ نہ فرد کو تشریع و احکام کی بنیاد قرار دینا چاہتا ہے اور نہ معاشرہ کو کوئی مرکزی حیثیت دینا چاہتا ہے، اس کا عقیدہ یہ ہے کہ جس نظام میں یہ توازن نہ ہوگا وہ زندگی کا صالح دستور نہیں بن سکتا، اس میں یا تو فردی خواہشات کا احترام ہوگا اور معاشرہ خطرات و مصائب کا شکار ہو جائے گا یا فردی خواہشات پر پابندی عائد کی جائے گی اور فرد اور تشریع میں داخلی جنگ چھڑ جائے گی اور اس طرح اجتماعی نظام خطرہ میں پڑ جائے گا، دوسروں کے خواہشات پامال کیے جائیں گے اور حکام کی خواہش پرستی کا دروازہ پاٹوں پاٹ کھل جائے گا۔ اس لئے ضرورت ہے کہ انسان کو اخلاقی تربیت دے کر ایک ایسے سانچے میں ڈھال دیا جائے کہ وہ ذاتی مفاد کی قربانی کو اپنے اوپر جبر نہ سمجھے بلکہ اسے اپنی ترقی کا ذریعہ اور زندگی کا اعلیٰ مقصد تصور کرے۔

معنوی زندگی اور اخلاقی تربیت سے ہٹ کر جو نظام بھی بنایا جائے گا وہ انسانی جذبات کو مجروح تو کر سکتا ہے، افراد کے خواہشات پر پابندی تو عائد کر سکتا ہے لیکن جذبات و تشریعات اور خواہشات و تعلیمات میں توازن نہیں قائم کر سکتا اور توازن کا نہ ہونا ہی نظام کی تباہی کے لئے کافی و وافی ہے۔ اسلام نے انھیں خطرات کو محسوس کر کے معنوی تصور اور اخلاقی تربیت کو بنیادی مقصد قرار دیا اور یہ طے کر دیا کہ اپنی پوری تشریع کو انھیں دونوں محوروں پر گردش

دے گا۔ اس کا نظریہ یہ ہے کہ انسان کو معنوی زندگی اور اخلاقی احساس سے الگ کرنے کے بعد اجتماعی سکون واطمینان کی توقع ایک وہم و خیال سے زیادہ کچھ نہیں ہے اخلاقی اقدار کا انکار اور اقتصادی عامل پر ایمان انسانی زندگی کی اصلاح اس وقت تک نہیں کر سکتے جب تک انسان کو ایک ایسا میکانیکل آلہ نہ بنا دیا جائے جس پر جذبات کی جگہ پر سوئچ کام کر رہے ہوں اور احساسات کی جگہ آلات کو دے دی گئی ہو۔

معنوی زندگی اور اخلاقی احساس کی بنیاد پر انسانی زندگی کی تشکیل کوئی بڑا دشوار گذار امر نہیں ہے جس سے مایوسی لازمی قرار دے لی جائے بلکہ یہ کام وہ ہے جیسے صدیوں سے آسمانی مذاہب انجام دے رہے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ آج کے دور میں پائے جانے والے معنوی تصورات، اخلاقی اقدار، پاکیزہ احساسات اور صحیح جذبات کی کوئی صحیح توجیہ اس کے علاوہ نہیں ہو سکتی کہ ان سب کو انھیں مذاہب کی صدہا سال کی خدمتوں کا نتیجہ قرار دیا جائے اور یہ تسلیم کر لیا جائے کہ یہ انھیں سماوی ادیان کی زحمتوں اور مشقتوں کا باقیماندہ اثر ہے۔

اسلام نے اپنی نورانی مشعل بشریت کی محفل میں اس وقت روشن کی جب انسانی فکر میں کچھ نورانیت آچکی تھی، بشری ذہن کسی قدر افکار سے آشنا ہو چکا تھا اس لئے اس نے معنوی زندگی اور اخلاقی احساس کے تصور کو اور بھی وسیع کر دیا اور رضائے الٰہی کا ایک ایسا پرچم لہرا دیا جس کے زیر سایہ ⅟₁₂ دنیا آگئی ــــ اسلام کا مقصد یہ تھا کہ پورے عالم بشریت کو ایک نقطہ پر جمع کر دے اور سب کی مرکزی فکر کو متحد بنا دے۔ اس کی نظر میں اسلامی حکومت کے دو اہم اور بنیادی فرض تھے۔ ایک انسان کو فکری اور ذہنی اعتبار سے اسلامی افکار کے

سانچے میں ڈھال کر ذہنوں کی جدید تشکیل کرنا اور دوسرے باہر سے اس تربیت کی نگرانی کرنا تاکہ صراط مستقیم سے ہٹنے والے کو پھر راہ راست پر لایا جا سکے۔ اور یہی وجہ تھی کہ اس نے اپنی فکر کو صرف ایک ذہنی تصور نہیں بنایا بلکہ اپنے نظام کو ایک ایسی سیاسی فکر کے سانچے میں ڈھال دیا جس میں حیات و کائنات، سیاست و اجتماع، اقتصاد و اخلاق سارے مسائل سمٹ آئیں۔ اس کے علاوہ سارے نظام وہ ہیں جو یا تو انسانی مسائل کو دیکھنے اور سمجھنے کے لئے کوئی معین زاویہ نظر نہیں رکھتے یا ان کا زاویہ نظر خالص مادی ہے جو انسانیت کو ہر طرح تباہ و برباد کرنے کے لئے کافی ہے۔

٭

اسلام

اور

حریت و ضمانت

گذشتہ صفحات میں یہ واضح کیا جاچکا ہے کہ سرمایہ داری اور اشتراکیت دو مرکزی محوروں پر گردش کررہی ہیں سرمایہ داری کا محور ہے۔ حریت اور اشتراکیت کا محور ہے اجتماعی ضمانت ـــــ اس وقت اسلام کے مؤقف کو واضح کرنے کے لئے ہمیں ان سب کا ایک تقابلی مطالعہ کرنا پڑیگا جس میں سرمایہ داری سے مقابلہ حریت کے میدان میں ہوگا اور اشتراکیت سے مقابلہ اجتماعی ضمانت کے میدان میں۔

حریت سے ہماری مراد لفظ کے عام لغوی معنی ہی ہیں یعنی "غیر کے جبر کی نفی" اسلئے کہ یہی معنی دونوں نظاموں میں مشترکہ طور پر پائے جاتے ہیں اور اسی معنی کے اعتبار سے اسلامی ارشادات میں اس لفظ کا استعمال ہوا ہے۔ امیر المومنینؑ کا ارشاد ہے "کسی غیر کے غلام نہ بنو خدا نے تمھیں آزاد پیدا کیا ہے ـــ اور امام جعفر صادق فرمایا کرتے تھے "جس میں پانچ باتیں نہ ہوں اس سے زیادہ خیر کی توقع نہیں، وفا۔ تدبیر۔ حیا۔ حسن اخلاق اور ان سب کی جامع صفت حریت"۔

حریت کا لفظ سرمایہ دارانہ نظام کی پیداوار نہیں ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس نظام نے اس کے عام معنی میں اپنے فکری اور نظریاتی خصوصیات کو شامل کرکے اسے اپنا شعار بنالیا ہے اور اس کے اصلی معنی کو مسخ کردیا ہے۔

سرمایہ دار معاشرہ کی حریت اور اسلامی اجتماع کی حریت کا نمایاں فرق یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ حریت کا آغاز بے پناہ شک سے ہوتا ہے جو انقلابی منزل میں خود مختاری کی شکل میں تحلیل ہو جاتا ہے اور ہر انسان اپنے کو اپنا مختار سمجھنے لگتا ہے اور اسلامی معاشرہ کی حریت کی بنیاد اللہ پر ایمان ہے جس میں انقلابی معنی خود بخود پوشیدہ ہیں کہ جتنا یہ عقیدہ پختہ ہوگا اتنا ہی انقلابی جذبہ عام و تام ہوگا

دوسرے لفظوں میں یوں کہا جائے کہ سرمایہ دار حریت ایک مثبت مفہوم ہے جس میں ہر انسان اپنے معاملات میں اس قدر خود مختار ہے کہ حکومتی تنظیمات بھی اپنے اختیارات میں افراد ہی کے مقرر کرنے کی محتاج ہیں اور اسلامی حریت ایک انقلابی تصور ہے جس میں انسان اللہ کا بندہ اور دنیا کی ہر طاقت سے بلند و بالا ہو جاتا ہے اس کے ذہن میں یہ بات راسخ ہو جاتی ہے کہ اس پوری کائنات کا خالق و مالک ایک ہے لہٰذا اس کے سامنے مجھ میں اور دوسرے افراد میں کوئی فرق نہیں ہے سب اسی کے بندے ہیں اور سب کا وہی ایک حاکم و مالک ہے اب کسی انسان کو اپنے نفس پر بھی تصرف کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ یا یوں کہہ لیجئے کہ کہ سرمایہ دار حریت خود مختاری ہے اس لئے ہر انسان حریت پر اختیار رکھتا ہے اور اسے ساقط کر کے غلامی اختیار کر سکتا ہے لیکن اسلامی حریت بندگی کا نتیجہ ہے اس لئے کسی آدمی کو بھی اس کے ساقط کرنے کا حق نہیں ہے "کسی غیر کے غلام نہ بنو کہ خدا نے تمہیں آزاد پیدا کیا ہے"۔

سرمایہ دارانہ معاشرے کی حریت

مذکورہ بالا اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ سرمایہ دار معاشرے میں آزادی کا خیال اس ہمہ گیر شک کا نتیجہ ہے جو یورپ کی پوری ذہنیت پر مسلط ہو چکا تھا اور جس نے ہر شعبہ زندگی سے اعتبار ختم کر لیا تھا۔ ہر تحقیق جدید انکشافات کی روشنی میں وہم دکھائی دے رہی تھی اور ہر عقیدہ تازہ تحقیقات کی روشنی میں توہم و جنون ــــ علمی انقلابات کا دور دورہ تھا، فکر و عقیدہ کے بت یکے بعد دیگرے ٹوٹ کر گر رہے تھے، حیات و کائنات کے نئے مفاہیم تیار ہو رہے تھے اور انسان کی عقلی اور دینی شخصیت کا نیا سنگ بنیاد رکھا جا رہا تھا۔

ان انکشافات اور انقلابات کا نتیجہ یہ ہوا کہ مغرب کے انسان نے کائنات کو نئی عینک سے دیکھنا شروع کر دیا اور ماضی کے تمام ترکے شک و شبہ کی نظر سے دیکھے جانے لگے، فکری میراث کا اعتبار اٹھتا گیا اور جدید تخلیقات نے اپنا اعتبار جمانا شروع کر دیا۔ اب صورت یہ ہو گئی کہ بطلیموس کا انکشاف کیا ہوا عالم اس عالم سے بالکل مختلف ہو گیا جس کا انکشاف "کوبرنیکوس" نے کیا اور جس میں زمین کی حیثیت آفتاب کے ایک تابع کی تھی اور بس! گلیلو وغیرہ کی انکشاف کردہ طبیعت اس طبیعت سے بالکل جداگانہ دکھائی دینے لگی جسکا پتہ علمار مذہب اور روسار ہیئت نے دیا تھا، ٹامس اکوینی اور ڈانٹے کے فلسفے ہوا میں اڑتے نظر آنے اور کل کے بدیہیات آج کے خرافات داوہام بن گئے۔

یہیں تک بات محدود نہ رہی بلکہ اخلاقی قدریں اور تربیتی اصول بھی شک و شبہ کی روشنی میں دیکھے جانے لگے اور یہ ہونا بھی چاہئے تھا اس لئے کہ اب اسطوری

خیالات بے عقب ہو چکے تھے اور سارا عالم اپنے حالات اور ماحول کو علم و اعتبار کی نظروں سے دیکھ رہا تھا، غیبی تصورات مشاہدات کی مار کھا چکے تھے اور اخلاق و اقدار علمی انقلابات کی نذر ہو چکے تھے۔

مغرب کا مذہب جواب تک جذبات کی بنیاد پر پروان چڑھ رہا تھا اور جس میں کنیسہ کے مظالم و مصائب حد آخر تک پہونچ چکے تھے ایک نئے ننتک کا شکار ہو گیا اور اس کا بھیانک اثر یہ ہوا کہ اخلاقی قدریں بھی اسی کی زد میں آگئیں تحقیقات و انکشافات سے مدہوش ہونے والا یہ نہ سوچ سکا کہ کنیسہ کا کردار الگ ہے اور اخلاقی اقدار الگ، جذباتی افکار الگ ہیں اور عقلی نظریات و اصول الگ۔

بات اصل یہ تھی کہ اخلاقی اصول و قواعد مذہب سے پوری طرح وابستہ تھے اور جب مذہب ہی کی بنیاد متزلزل ہو گئی تو اخلاقی قدروں کا اعتبار کہاں سے رہ جاتا۔ مذہب کا واسطہ غیب سے تھا اس کی بنیاد اخروی جزا و سزا پر تھی اور جدید انکشافات نے غیب سے انسان کا رشتہ توڑ کر اس کی فکر کا سنگ بنیاد مشاہدات و تجربات پر رکھ دیا تھا۔ اور یہ تاریخ کی ایک تلخ حقیقت ہے کہ جب مذہب والوں کا تمرد حد سے بڑھ جاتا ہے تو باغیوں کے انقلابات بھی محدود نہیں رہ سکتے چنانچہ سوفسطائیوں نے بھی خداؤں کا انکار اسی بنیاد پر کیا تھا اور ہر مذہب میں شک کا ایک پہلو دوسرے پہلو کو متاثر کئے بغیر نہیں رہ سکا۔ اب مغرب کا یہ عالم ہو گیا تھا کہ مذہبی پابندیاں ختم ہو چکی تھیں اور ہر شخص اپنے تصرفات میں خود مختار بن چکا تھا۔ انسان کھلی فضا اور آزاد ہوا میں سانس لے رہا تھا اور حدود و قیود کی دنیا کا سلسلہ ٹوٹ چکا تھا۔

انھیں حالات میں فکری اور شخصی آزادی کا تصور منظر عام پر آیا۔ فکری آزادی علمی انقلابات کے نتیجہ میں پیدا ہوئی جہاں قدیم مسلمات نذر شک ہو چکے تھے نہ کوئی ایسی حقیقت رہ گئی تھی

جو نا قابل انکار ہو اور نہ کوئی ایسا مسلمہ رہ گیا تھا جس میں شبہ نہ کیا جا سکے شخصی آزادی فکری دنیا کے انقلاب کے رد عمل کے طور پر پیدا ہوئی کہ جب اخلاقی اقدار اور روحانی افکار مشکوک و بیکار ہو چکے ہیں تو اب ہر شخص کو اپنے اعمال و افعال میں خود مختار ہونا چاہیئے اور اس پر کوئی فوقانی پابندی عائد نہ ہونی چاہیئے۔

یہیں سے اقتصادی آزادی کی بنیاد پڑ گئی جو آزادی کے سلسلے کی تیسری کڑی تھی تاریخ فکر انسان نے جب شخصی آزادی کی بنیاد ڈالی اور اسی آزادی پر نئی قدروں کی عمارت قائم کرنا شروع کر کے حیات و کائنات پر جدید نظر ڈالی تو اسے زندگانی دنیا لذت و راحت کے حصول کا بہترین ذریعہ دکھائی دی اور اس نے یہ طے کر لیا کہ یہ لذت و راحت بغیر مال کے حاصل نہیں ہو سکتی، لہٰذا مال ہی وہ جادو کی کنجی ہے جس سے ہر قفل لذت کھولا جا سکتا ہے اور یہی وہ اعلیٰ وسیلہ ہے جس کے ذریعہ جدید طرز کا انسان لطف اندوز ہو سکتا ہے اس لیے اقتصادی آزادی بھی انتہائی ضروری ہے ۔ یہ خیال آنا تھا کہ جدید صنم یعنی مال کے تمام راستے کھل گئے اور اس راہ کی ہر قربانی ایک شریف و بابرکت عمل بن گئی ۔ اب جیسے جیسے روحانی اور فکری مفروضات میدان سے ہٹتے رہے ویسے ویسے اقتصادیات کو اہمیت ملتی رہی یہاں تک کہ مغربی معاشرہ میں ایک ایسا دور بھی آ گیا جب مارکسیت کو یہ خیال ہو گیا کہ اقتصاد ہی انسانی تاریخ کے ہر دور کا واقعی محرک ہے اور ظاہر ہے کہ اقتصادی آزادی بغیر سیاسی آزادی کے مکمل نہیں ہو سکتی تھی، اقتصادی خواہشات کی تحصیل کے لئے یہ ضروری تھا کہ انسان کو سیاسی طور پر مکمل آزادی حاصل ہو اور حکومت ارباب اقتصاد کے سامنے رکاوٹیں نہ پیدا کر سکے اس لئے آزادی کے سلسلے کی چوتھی کڑی بھی ضروری قرار پا گئی اور اس طرح مغربی معاشرے کی آزادی کے چاروں ارکان مکمل ہو گئے اور یہ بات واضح ہو گئی کہ مغربی معاشرے میں آزادی کا سلسلہ علمی دنیا کے شک سے شروع ہوا ہے

جس کی انتہا آزادی پر ایمان و عقیدہ کی منزل تک پہونچ گئی ہے۔ وہاں کا آزادی کا مفہوم مثبت ہے یعنی ہر انسان اپنے نفس کا مختار رہے اسے کوئی قوت دبا نہیں سکتی۔ اس کا اختیار صرف اسی حد تک نہیں ہے کہ اس پر غیروں کا تسلط نہ رہے بلکہ وہ اس حد تک خود مختار ہے کہ اپنے نفس کا باقاعدہ مالک بنا رہے اور خدا و آخرت سے اس کا رشتہ ٹوٹ جائے۔

اسلام کی آزادی اس سے بالکل مختلف ہے وہ آزادی کے منفی مفہوم کا حامل ہے اس کی نظر میں آزادی ایک انقلابی مفہوم ہے جس میں انسان غیر کے تسلط سے آزاد ہو جاتا ہے اور اس کے ہاتھ قید و بند سے کھل جاتے ہیں یہی اس کا اعلیٰ مقصد اور عمدہ ہدف ہے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ ہمارا رسول لوگوں سے قدیم جکڑ بند کو مٹانے کے لئے آیا ہے ——— (اعراف ۱۵۶) لیکن اس کا مطلب مغربی قسم کی آزادی نہیں ہے یعنی اسلام اس آزادی کو نفس کی خود مختاری کا نتیجہ نہیں سمجھتا بلکہ اللہ کی عبودیت اور بندگی کا نتیجہ سمجھتا ہے وہ سارے انسانوں کو ایک صف میں اس لئے نہیں کھڑا کرتا کہ سب خود مختار اور آزاد ہیں بلکہ اس لئے کھڑا کرتا ہے کہ سب ایک خدا کے بندے ہیں اور کسی کو دوسرے پر دباؤ کا حق نہیں ہے۔ یہاں تک کہ خود اس کے خواہشات بھی اسے مجبور نہیں کر سکتے ——— اسلام میں آزادی کی بنیاد اللہ کی خالص بندگی ہے جس کے آگے وہ تمام بت توڑ دینے کے قابل ہیں جو انسانی شرافت کی قربانی چاہتے ہیں اور جنھوں نے ہمیشہ اس کی عظمت کو بھینٹ چڑھایا ہے ———

"اے رسول اہل کتاب سے کہو کہ آؤ ہم سب ایک اعتدالی کلمہ پر اتفاق کر لیں صرف خدا کی عبادت کریں کسی کو اس کا شریک نہ بنائیں اور نہ آپس میں ایک دوسرے کی ربوبیت کا اعتراف کریں" (آل عمران ۶۴) ——— "کیا تم لوگ اپنے ہاتھ کے تراشے ہوئے بتوں کی پرستش کرتے ہو جبکہ خدا نے تمہیں اور ان بتوں کو دونوں ہی کو پیدا

کیا ہے" (صافات ۹۵-۹۶) ــــــ "خدا کے علاوہ جنھیں بھی بلاتے ہو وہ سب تمھیں جیسے بندے ہیں" (اعراف ۱۹۴) ــــــ "قید خانے والو یہ بتاؤ کہ ایک خدائے واحد و قہار اچھا ہے یا متفرق قسم کے خدا؟" (یوسف ۳۹)

یہی وہ طریقہ تھا جس سے اسلام نے آزادی کی تعلیم دی اور یہ بتایا کہ اللہ کی بندگی ہی تمام حریتوں کی بنیاد اور جملہ آزادیوں کی جڑ ہے۔ اللہ کی خالص بندگی کے معنی یہ ہیں کہ انسان کسی غیر کے سامنے سر نہ جھکائے اور کائنات کی کسی شے سے مرعوب نہ ہو۔ سب کو اپنے خالق کی مخلوق اور برابر کی سطح کی چیز تصور کرے۔

اسلام اور مغرب کی حریت میں یہ بات مشترک ضرور ہے کہ دونوں انسان کو آزادی دلانا چاہتے ہیں لیکن اس کے بعد بھی اس کی بنیادوں میں زمین۔ آسمان کا فرق ہے، اسلام کی بنیاد عبودیت اور ایمان ہے اور مغرب کی بنیاد اپنے اوپر اعتماد اور خود رائی۔ اسلام میں اقدار و افکار کا احترام ہے اور مغرب میں سب کی تشکیک اور سب کا انکار۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی حریت کی بازگشت عقیدہ توحید کی طرف ہو جاتی ہے اور جتنا انسان کے ذہن میں یہ عقیدہ پختہ اور یہ خیال مستحکم ہوتا ہے اتنا ہی اس کا نفس بلند اور اس کا احساس پاکیزہ ہوتا ہے۔ وہ طغیان و سرکشی، بغاوت و استحصال کی مخالفت کر سکتا ہے اور دنیا کی کسی شے سے مرعوب نہیں ہو سکتا۔" صاحبان ایمان تک جب بغاوت پہونچتی ہے تو وہ فاتح ہوتے ہیں" (شوریٰ ۳۹)

اسی کے برخلاف مغرب کی حریت ہے جس میں شک و شبہ کے علاوہ کچھ نہیں ہے اور جس کی بنیاد انتہائی کھوکھلی ہے اس کا فلسفہ مدہوشی اور اس کی اصل خود رائی و خود پرستی ہے۔ ایسی حریت کا اسلامی حریت سے موازنہ کرنے کے لئے ہمیں دو مقامات پر بحث کرنا پڑے گی۔ ایک کا نام انفرادی حریت ہو گا

جس کا نام ہم نے شخصی حریت رکھا ہے اور ایک کا نام اجتماعی حریت ہے جسکے دائرے میں فکری، سیاسی اور اقتصادی تینوں قسم کی آزادیاں شامل ہوجاتی ہیں ـــــ شخصی حریت انسان کے انفرادی سلوک کا فیصلہ کرتی ہے اور اجتماعی حریت اسے معاشرہ کی ایک فرد سمجھ کر اس کے سلوک کا فیصلہ کرتی ہے جہاں اسے یہ اختیار دیدیا جاتا ہے کہ وہ جس طرح چاہے سوچے اور جس چاہے اپنے افکار کا اعلان کرے، جسے چاہے حاکم بنائے اور جسے چاہے معزول کردے، جس انداز سے چاہے دولت جمع کرے اور جس انداز سے چاہے صرف کردے۔

شخصی حریت

مغربی تمدن کی ہمیشہ یہ خواہش رہی ہے کہ انسان کو اپنے سلوک و طریقہ کار میں زیادہ سے زیادہ آزادی دلائی جائے، اس کی آزادی پر اس وقت تک کوئی پابندی نہ لگائی جائے جب تک اس آزادی سے دوسرے افراد مرعوب و متاثر نہ ہوں، اس کی نظر میں اس آزادی کے طریقہ استعمال اور اس سے پیدا ہونے والے نتائج کی کوئی اہمیت نہیں ہے اس کا مقصد صرف افراد کو اپنے تصرفات میں آزاد کرا دینا اور اپنے ارادوں پر خودمختار بنا دینا ہے، اس کے نزدیک شرابی کتنی ہی شراب کیوں نہ پی جائے اور اس کی عقل کسی حد تک کیوں نہ معطل ہو جائے کوئی حرج و مضائقہ نہیں ہے اس لئے کہ وہ اپنے اختیارات کو صرف کر رہا ہے اور دوسروں کو نقصان نہیں پہونچا رہا ہے ـــــ یہی نغمہ تھا جس نے انسانیت کو مست و مدہوش کر دیا اور انسان ایک عرصہ تک یہ سوچتا رہ گیا کہ مغربی تہذیب نے

سب سے پہلے دنیا کی جکڑ بند سے رہائی دلائی ہے اور وہ اس کے زیر سایہ پہلے پہل ہزار ہا سال کی دبی ہوئی سانسوں کو ابھارنے کے قابل بنا ہے اب اسے روشنی میں کام کرنے کا اختیار مل گیا ہے اور اس کے سر سے تمام اضطرابات ہٹ گئے ہیں ــــ لیکن افسوس یہ شیریں خواب زیادہ دیر تک نہ رہ سکا اور انسان دھیرے دھیرے بیدار ہونے لگا اسے یہ محسوس ہونے لگا جیسے یہ آزادی خود ایک مستقل قید ہے اور اس حریت نے اس کی تمام امیدوں پر پانی پھیر دیا ہے وہ ایک گاڑی میں جوت دیا گیا ہے اور اسی کے ساتھ بندھا چلا جارہا ہے نہ اس کو راستہ بدلنے کا اختیار ہے اور نہ ٹھہرنے کا ــــ اس کی تسکین کا کل سامان یہ کلمہ ہے کہ "یہ گاڑی آزادی کی گاڑی ہے اور یہ قید و بند حریت کی دوسری تعبیر ہے ــــ"

سوال صرف یہ ہے کہ آزادی، قید و بند اور یہ حریت پابندی کیونکر بن گئی اور انسان کو یہ احساس کیونکر پیدا ہو گیا کہ وہ ایک گاڑی میں بندھا کھنچتا چلا جارہا ہے؟ درحقیقت یہی وہ بات ہے جسے اسلام نے چودہ صدی قبل محسوس کیا تھا اور اس نے انسان کو ایسی کھلی آزادی سے روک دیا تھا جس کے تجربات میں پابندیوں کا سامنا کرنا پڑے اور جو مقام عمل میں مشلول و مفلوج ہو جائے اس نے حریت کا نہایت عمیق تصور اور آزادی کا بڑا بلیغ خیال پیش کیا تھا اس کا مطلب یہ تھا کہ انسان صرف ظاہری قید و بند سے آزاد ہو بلکہ نفسانی، فکری پابندیوں سے بھی آزاد ہو جائے۔ اس کی آزادی تاریخ کی تمام آزادیوں سے زیادہ پاکیزہ اور اس کی حریت دنیا کی تمام حریتوں سے زیادہ بلند ہو۔ وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ مغرب کی طرح انسانی تمدن کا آغاز حریت و آزادی سے ہو اور انجام کار عبودیت، پابندی، قید و بند کا شکار ہو جائے بلکہ اس کا مقصد

یہ تھا کہ آغاز کار عبودیت، بندگی اور ایمان سے ہو اور انجام میں جملہ پابندیوں سے آزادی مل جائے ــــــ!

اسلام نے انسانی آزادی کا کام خود اس کے داخل سے شروع کیا ہے اس کی نظر میں حریت کے معنی صرف یہ نہیں ہیں کہ کسی آدمی سے کہدیا جائے کہ راستہ کھلا ہوا ہے تشریف لے جائیے بلکہ حریت کا حقیقی مفہوم یہ ہے کہ انسان اپنے اختیارات کو ختم کرے، سفر میں ہوش و حواس کو سلامت رکھے اور اپنے طرز عمل کو فکر و نظر کی روشنی میں معین کرے اور یہ وہ کام ہے جس کے لئے سب سے پہلے خواہشات سے آزاد ہونا پڑے گا تاکہ خواہش خود ایک تنبیہ بن جائے اور ارادے پر قابو نہ پاسکے، خواہش کے ارادہ پر غلبہ کا مقصد حریت کی موت اور آزادی کی تباہی ہے اس میں کوئی شرف نہیں ہے کہ انسان کے ہاتھ کھلے رہیں اور اس کی عقل پر خواہشات مسلط رہیں، حقیقی شرف یہ ہے کہ ہاتھوں کی طرح عقل و فکر بھی خواہش کے حدود و قیود سے آزاد رہے اور انسان حیوانات سے الگ ایک مخلوق معلوم ہو اور ظاہر ہے کہ انسان اور حیوان میں امتیاز کی جہت صرف عقل و خواہش کا متوازی اقتدار ہے، خواہش عقل پر غالب آجائے تو حیوانیت ہے اور عقل خواہش پر قابو پالے تو انسانیت ورنہ ارادہ و اختیار سے تصرف تو دونوں ہی کے یہاں ہوتا ہے اس میں انسان ہی کی کیا خصوصیت ہے انسان کا امتیاز تو اسی طاقت میں ہے کہ وہ خواہش کو عقل پر غالب نہ آنے دے۔ اس لئے اگر ہم نے ظاہری آزادی پر اکتفا کرلی اور اسے آزاد بنا کر اس کے سامنے تمام خواہشات کو ابھارنے والے عناصر رکھ دیئے تو یہ اسکی آزادی نہ ہوگی بلکہ رفتہ رفتہ آزادی کی بربادی ہوگی اور انسانیت کی تباہی، جیسا کہ مغربی تمدن نے کیا کہ اس نے انسان کو خواہشات کا تابع بنا کر اپنے افعال میں

یوں خود مختار بنا دیا ہے کہ درمیان راہ میں ایک مرتبہ اسے یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ وہ حقیقتاً اپنے ارادے پر حاکم نہیں ہے بلکہ اپنے خواہشات کا محکوم ہے، اسلام نے اسی نکتہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے پہلے انسان کے نفس کو مضبوط بنایا اس کی پرورش کی لئے اسے غذائیں مہیا کیں، اس کی انسانی تربیت کی اور اسے حیوانیت سے الگ کیا، اس کے ذہن میں یہ نکتہ راسخ بنایا کہ تیری شان خواہشات کے ساتھ بہنا نہیں ہے بلکہ تیرا فریضہ اعلیٰ قدروں کے لئے سعی و کوشش اور بلند مقاصد کے لئے جد و جہد کرنا ہے، خواہشات کی پابندی تیری عظمت کے خلاف اور شہوتوں کا اتباع تیری حیثیت کے منافی ہے، تیرے ہاتھ ہر وقت کھلے رہنے چاہئیں اور تیرے اقدامات عقل و فکر کی روشنی میں ہونے چاہئیں ایسا نہ ہو کہ تو اپنے اعمال و افکار میں ہاں اور نہیں سے بھی محروم ہو جائے اور خواہشات کے آگے تیرا منہ کھلا کا کھلا رہ جائے۔

قرآن حکیم نے روحانیت کی اعلیٰ تعلیم سے یہی مقصد حاصل کرنا چاہا تھا وہ یہی چاہتا تھا کہ انسان زمین کے پست مقاصد کو نظر انداز کر کے وسیع فضا پر نظر کرے اور بلند مقاصد کے لئے رفتار عمل کو تیز تر کر دے۔ ارشاد ہوتا ہے:

"لوگوں کے لئے مختلف خواہشات عورت، اولاد سونے اور چاندی کے ڈھیر، نشان زدہ گھوڑے، جانور، زراعت کی محبت آراستہ ہو گئی ہے حالانکہ یہ سب دنیا کی متاع ہے اور اللہ کے یہاں بہترین محل و مکان ہے ـــــ اے رسول کہدو کہ کیا میں تمہیں اس سے بہتر چیز بتاؤں ـ؟ یاد رکھو کہ صاحبان تقویٰ کے لئے اللہ کے پاس وہ جنتیں ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہیں وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے، ان کے لئے پاکیزہ بیویاں اور اللہ کی رضا مہیا ہے اور خدا تو اپنے بندوں کو خوب جانتا ہے ـــــ" (آل عمران ۱۴-۱۵)

یہ ہے درحقیقت انسان کے باطن کی آزادی جس کے بغیر ہر لفظ آزادی کھوکھلا اور ہر تصور حریت بے معنی ہے، اسلامی حریت کی بنیاد یہی تطہیر نفس ہے جس میں خواہشات کے خلاف عظیم محاذ قائم کیا گیا ہے اور اس کے علاوہ ہر شے کو قید و بند تصور کیا گیا ہے۔ قرآن کی اس آیت کا گہرا مطالعہ بھی اس بات کو واضح کرتا ہے کہ یہاں بھی اسلام نے خواہشات سے آزادی اور نفس کی تطہیر کے لئے وہی طریقہ استعمال کیا ہے جو اس نے دیگر مقامات پر تطہیر نفس کے لئے استعمال کیا تھا یعنی طریقہ توحید — وہ جب انسان کو زمین اور اس کی لذتوں سے بے نیاز بناتا ہے تو اسی کے ساتھ ساتھ آسمان اور اس کی جنتوں سے روشناس بھی کراتا ہے اللہ کی رضامندی کی پیشکش کرتا ہے اس لئے کہ توحید ہی داخلی آزادی کی سند اور خارجی آزادی کا وسیلہ ہے۔

ہم اس مقام پر ایک ہی مثال پیش کریں گے جس سے داخلی آزادی کا مفہوم واضح ہو جائے گا اور قرآن کی پیش کی ہوئی آزادی کا مغربی آزادی سے تفرقہ بھی ہو جائے گا اور وہ مثال ہے شراب — قرآن کریم نے اپنی تربیت کے اعتماد پر اتنی قوت پیدا کر لی تھی کہ اپنی امت سے ایک دفعہ یہ کہدے کہ شراب نہیں — اور شراب اس کے لغت سے محو ہو جائے اس لئے کہ امت اپنے ارادے پر مسلط اور اپنی خواہشات پر غالب تھی یعنی حقیقی حریت سے بہرہ اندوز تھی — بر خلاف مغربی تمدن کے کہ وہاں ظاہری حریت کا ڈھنڈورا پیٹنے کے باوجود کسی کو اپنے ارادے پر اختیار نہیں ہے اور ہر شخص خواہش کے دھارے پر بہہ رہا ہے اور یہی وجہ ہے کہ امریکہ کے بے پناہ پروپیگنڈے کے باوجود امریکی قوم شراب جیسی لعنت سے نجات نہ پا سکی اور حکومت کی ساری قوتیں شل ہو گئیں — صرف اس لئے کہ امریکی قوم کا کوئی شخص بھی حقیقی حریت کے مفہوم سے آشنا نہ تھا وہ صرف آزادی کے

لفظ کو پہچانتا تھا اس لیے وہاں کے نظام میں نہیں کہنے کی قوت ہی نہ تھی اور نہ وہ اس نہیں پر عمل کرنے کے قابل تھا۔

اسلام کی نظر میں یہی داخلی حریت اور تہذیب نفس اجتماعی قلعے کی تعمیر میں سنگ بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے اس کا خیال ہے کہ جب تک لوگ اپنے ارادے کے مختار نہ ہوں گے اور ان میں خواہشات کے مقابلے میں اخلاقی اور روحانی اقدار کے تحفظ کا جذبہ نہ ہوگا اس وقت تک کوئی اعلیٰ معاشرہ وجود میں نہیں آسکتا اور نہ اس معاشرے کو حقیقی طور سے آزاد کہا جا سکتا ہے ——— ارشاد ہوتا ہے "خدا اس وقت تک قومی حالات کو نہیں بدلتا جب تک لوگ اپنے انفرادی حالات کو نہ بدل لیں ——— (رعد ۱۱) "جب ہم کسی قریے کو ہلاک کرنا چاہتے ہیں تو اس کے دولت مندوں پر احکام نافذ کرتے ہیں وہ ان کی مخالفت کرتے ہیں ہماری حجت تمام ہو جاتی ہے اور ہم انھیں تباہ و برباد کر دیتے ہیں" (الاسراء ۱۶)

اجتماعی حریت

اسلام نے جس طرح شخصی آزادی کے میدان میں داخلی حریت کا اہتمام کیا ہے اسی طرح اجتماعی آزادی کے میدان میں بھی ایک انقلابی قدم اٹھایا ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ انفرادی آزادی کے میدان میں خواہشات کے بتوں کو توڑ دیا جائے اور اجتماعی آزادی کے میدان میں اجتماعی بتوں کو توڑ کر انسان کو انسان پرستی سے آزاد کرا دیا جائے۔ اس کا اعلان ہے ”اے اہل کتاب آؤ ہم تم ایک درمیانی کلمہ پر اتفاق کر لیں، سب مل کر ایک خدا کی عبادت کریں، شرک کو چھوڑ دیں اور آپس میں ایک دوسرے کو خدا نہ بنائیں“! خدا کی بندگی ہی وہ ہے جو پورے عالم انسانیت کو ایک سطح پر لا سکتی ہے بندگی کے بعد سب ایک منزل پر آ جاتے ہیں اور کسی کو دوسرے کے استحصال کا حق نہیں ہوتا نہ فرد فرد کو دبا سکتی ہے اور نہ جماعت دوسری جماعت کو!

اسلام نے معاشرتی معرکہ میں بھی وہی طریقہ استعمال کیا ہے جس سے داخلی معرکہ میں مدد لی تھی یعنی یہاں بھی طریقہ توحید ہی کو اپنایا ہے اس کا اعلان ہے کہ ایک خدا کی بندگی کرو اور ہر پرستش سے جدا ہو جاؤ۔ دنیا کی کسی قوت یا سماج کے کسی بت کے سامنے ذلت کا احساس نہ کرو، تمہارے ذہن میں یہی رہنا چاہیئے کہ سب ایک خالق کی مخلوق اور سب ایک حاکم کے محکوم ہیں!

انسانی زندگی میں بت پرستی کا ورود دو وجہوں سے ہوا کرتا ہے۔ کبھی انسان خواہش پرستی کی بنیاد پر مجبور ہو جاتا ہے کہ اپنی حریت اور خودداری کو قربان کر کے

کسی انسانی صنم کی پرستش کرے اور اس طرح اپنی خواہش کی تسکین کا سامان مہیا کرے — اور کبھی ان بتوں کی پرستش کے نتائج سے بے خبر ہو کر ان کی پوجا کرنے لگتا ہے اسلام نے ایک طرف خواہشات کے اتباع کو روک کر پہلی کڑی کو توڑا اور دوسری طرف ان انسانوں کی پرستش کے نتائج کا اعلان کیا — "خدا کے علاوہ جن کو بلاتے ہو وہ خود بھی تمہاری طرح کے بندے ہیں"

اسلام کی انھیں بنیادوں کی روشنی میں جن کے ذریعے اس نے انفرادی میدان میں خواہشات کی بندگی اور اجتماعی میدان میں صنم پرستی سے آزادی دلائی ہے — یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اسلام میں شخصی حریت کے حدود و قیود کیا ہیں؟ اور انسان اپنے ذاتی اعمال و افعال میں کس حد تک آزاد ہے؟ اور وہ اسطرح کہ مغرب میں شخصی آزادی کی آخری حد دوسروں کی آزادی کو قرار دیا گیا ہے وہاں انسان اپنے ذاتی اعمال میں اس وقت تک آزاد رہتا ہے جب تک کہ اس کی آزادی سے دوسرے افراد متاثر نہ ہوں لیکن اسلام اس سے بالکل مختلف ہے اس کی آزادی کی بنیاد دوسرے افراد یا ان کی آزادی نہیں ہے بلکہ اس نے آزادی کا سنگ بنیاد انسان کے داخل میں رکھا ہے اس کی نظر میں آزادی کا صحیح مفہوم خواہشات کی بندگی سے آزادی ہے اس لئے ذاتی اعمال کے میدان میں انسان وہیں تک آزاد رہ سکتا ہے جہاں تک اس کی بندگی اور توحید متاثر نہ ہو" تمہارے لئے زمین کی ہر شے کو پیدا کیا گیا ہے (البقرہ ۲۹)

"تمہارے لئے زمین و آسمان کی ہر شے کو مسخر کر دیا گیا ہے" (جاثیہ ۱۳) — یعنی ہر شے تمہارے زیر تصرف اور ہر موجود تمہارے زیر اختیار ہے لیکن شرط یہی ہے کہ جذبات و خواہشات کی پابندی نہ ہو اور صنم پرستی کا شائبہ نہ پیدا ہونے پائے اس لئے کہ یہ چیز اسلام کی حقیقی حریت کے منافی اور اسکے عقیدۂ توحید ہے

متصادم ہے، اس میں حریت کے گہرے معانی کی تباہی اور انسان کی واقعی عظمت کا خون ہے ـــــ حریت حیوانی خواہشات کی آزادی کا نام نہیں ہے بلکہ انسانی نظام کے ایک اہم فکری اور روحانی جذبہ کا نام ہے۔

یہ یاد رکھنے کی بات ہے کہ اسلام کی معاشرتی حریت بھی اپنے واقع کے اعتبار سے مغرب کی حریت سے متفق نہیں ہے بلکہ شخصی حریت کی طرح یہ حریت بھی ایک خاص مفہوم اور چند مخصوص حدود وقیود کی پابند ہے ـــــ مغرب میں سیاسی حریت کے معنی انسان کی خود مختاری اور غیر کے تسلط کی نفی کے ہیں اس لئے کہ اس کی بنیاد افراد کی باہمی مساوات پر ہے اور اس کا خیال ہے کہ جب قوانین تمام افراد معاشرہ پر نافذ ہوتے ہیں اور احکام کا اتباع سب کو کرنا پڑتا ہے تو قانون سازی کا اختیار بھی سب ہی کو ہونا چاہیئے۔ ایک آدمی کے قانون کو دوسرے پر بار کرنا ظلم اور ناانصافی ہے ـــــ لیکن ظاہر ہے کہ یہ فکر کبھی حقیقت کا جامہ نہیں پہن سکتی تھی اس لئے عملی میدان میں ایک تناقض کا شکار ہوگئی، حریت کا خیال تھا کہ سب کو مساوی اور برابر ہونا چاہیئے اور سب کی رائے کا احترام ہونا چاہیئے اور رائے کا یہ حال ہے کہ ہر شخص ایک الگ مزاج، الگ ذہن اور الگ دماغ رکھتا ہے ایک دوسرے کے خیال کا پابند نہیں ہو سکتا اس لئے ہر ایک کی رائے کی بنیاد پر کوئی قانون نہیں بن سکتا ـــــ نتیجہ یہ ہوا کہ اکثریت کا قانون وضع کیا گیا اور یہ طے پایا کہ اختلافی صورتوں میں فیصلہ اکثریت کے قول کے مطابق کیا جائے حالانکہ یہ بات حقیقی حریت کی سراسر موت تھی اور اس میں اقلیت کی رائے کا پامال ہونا ناگزیر تھا۔

یہ ممکن ہے کہ اقلیت بھی اکثریت کی رائے کے احترام پر بنیادی طور پر اتفاق کرلے لیکن یہ بہر حال طے ہے کہ اس کا اپنا ذاتی خیال بھی ہوتا ہے جسکی ترویج کے لئے

مواقع کی تلاش میں رہتی ہے اور ایک وقت وہ آجاتا ہے جب اقلیت اکثریت کی شکل اختیار کرلیتی ہے اور حکومت کا طرز بدل جاتا ہے ــــ علاوہ اس کے کہ تمام معاشروں میں ایسا بھی نہیں ہے بلکہ بہت سے معاشرے ایسے بھی ہیں جہاں اقلیت اپنے علاوہ کسی کی رائے کو قبول کرنے پر تیار نہیں ہے اور نہ اس کی نظر میں اکثریت کا فیصلہ اس کی صحت کا ضامن ہے۔

مقصد یہ ہے کہ مغربی معاشرہ کی سیاسی آزادی خیالی دنیا میں تو کامیاب ہو سکتی ہے لیکن عملی میدان میں اس کے وجود پیدا کرلینے کا کوئی امکان نہیں ہے اور اس میدان میں یہ حریت اکثریت کے بُت کی پوجا کی شکل اختیار کرلیتی ہے جس سے اسلام کو سو فیصدی اختلاف ہے اس کا نظریہ یہ ہے کہ سارے انسان ایک خدا کے بندے ہیں اور وہی خدا انسانی زندگی کے دستور کی ترتیب کا حق رکھتا ہے اس کے علاوہ انسان کو خود کوئی اختیار نہیں ہے اس کا کام صرف اتباع کرنا ہے اور بس!

"کیا متفرق خدا ایک خدائے واحد و قہار سے بہتر ہیں؟ حکم کا حق صرف خدا کو ہے اس کا حکم ہے کہ تم سب صرف اسی کی عبادت کیا کرو" (یوسف ۳۹، ۴۰)

"لوگوں نے اپنے علماء اور راہبوں کو خدا بنا لیا ہے اور خدا کو چھوڑ دیا ہے" (توبہ ۳۱)

ــــ اس انداز کی سخت تنقید اس بات کی واضح دلیل ہے کہ اسلام انسان کی حکومت انسان پر برداشت نہیں کر سکتا۔ اس کی نظر میں انسانی بت کی پرستش کسی حال میں بھی روا نہیں ہے ــــ اس لئے کہ اس نے سیاسی آزادی توحید اور بندگی کی بنیاد پر دی ہے۔ وہ مسئولیت کا بار بیک وقت تمام افراد کی گردن پر رکھنا چاہتا ہے "تم سب کے سب نگراں ہو اور تم سے اپنی اپنی رعایا کے بارے میں سوال کیا جائے گا" یعنی مغرب کی سیاسی آزادی حکومت سازی اور

قانون سازی کے معنی ہیں ہے اور اسلام میں سیاسی آزادی امانتداری اور ذمہ داری کے میدان میں مساوات کے معنی میں ہے جو سیاسی میدان میں دوسروں کے قانون کی پابندی سے آزاد کرادیتی ہے اور کسی فرد یا جماعت کے تسلط کو برداشت نہیں کرسکتی ـــــ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے فرعون اور اس کے تسلط کی بیحد مذمت کی ہے اس کا کہنا ہے کہ ـــــ "فرعون زمین میں بلند ہوا اس نے لوگوں کو چند ٹکڑوں میں بانٹ دیا اور ایک جماعت کو کمزور بنا دیا" (قصص ۴) اور یہ طریقہ کار اسلامی اصولوں کے خلاف ہے اس کی نظر میں کسی فرد یا جماعت یا طبقہ کا غلبہ سراسر ظلم اور ناانصافی ہے۔ اس طرح انسان ایک سطح پر نہیں آسکتے اور سب بندگی کی سرزمین پر نہیں کھڑے ہوسکتے!

اقتصادی آزادی بھی سرمایہ دارانہ تصور کے اعتبار سے ایک بالکل کھوکھلی آزادی ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ اقتصادی میدان میں ہر شخص آزاد ہے جس طرح چاہے کسب معاش کرے حکومت کوئی دخل اندازی نہ کرے گی یعنی حکومت کا موقف منفی ہے وہ سکوت کی پالیسی پر عمل کرے گی اس سے کسی مثبت عمل کی توقع بیکار ہے وہ اس امر کی ذمہ دار نہیں ہے کہ افراد کے لئے اسباب و وسائل بھی مہیا کرے یہ ان کا اپنا ذاتی فرض ہے جس کی کوئی مسئولیت حکومت کے ذمہ نہیں ہے ـــــ یہی وجہ ہے کہ اس آزادی میں ان لوگوں کا کوئی حصہ نہیں ہے جو مقدر کی خرابی سے وسائل سے عاری ہیں اور اقتصادی دوڑ میں دوسرے لوگوں کے ساتھ دوڑنے کے قابل نہیں ہیں ان کے حق میں یہ آزادی صرف ایک ڈھونگ ہے اور کچھ نہیں ـــــ ان کے لئے تو اس آزادی کا یہی مفہوم ہے کہ پیراکی کے فن سے ناواقف اور ہاتھ پاؤں سے بیکار افراد کو دریا میں ڈال کر ان سے کہدیا جائے کہ آپ کو پیرنے کی مکمل آزادی ہے آپ

جدھر چاہیئے جا سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ غریب کسی طرف بھی جانے کے قابل نہیں ہے .... ایسے اس آزادی سے کیا فائدہ ؟ آزادی کا تو صحیح تصور یہ تھا کہ ان کے لئے پیراکی کا انتظام کیا جاتا، انھیں اس فن سے ماہر بنایا جاتا اور اسکے بعد دریا کے حوالے کیا جاتا، پھر ان کے پہلو بہ پہلو ایسے ماہرین بھی چلتے جو انھیں ڈوبتے وقت سہارا دے سکیں اور غرق ہونے سے بچا سکیں ـــــ اسلام کی آزادی کا یہی مفہوم ہے کہ اس نے حریت کے ساتھ ضمانت کا قانون وضع کر کے یہ واضح کر دیا کہ ہم میدان سے آگے بڑھنے کی اجازت بھی دیتے ہیں اور عاجز لوگوں کے آگے بڑھنے کی ضمانت بھی لیتے ہیں۔ ہمارے یہاں افراد کو اپنی آزادی کی قربانی دینی پڑے گی اگر ان کی آزادی سے دوسرے افراد کی زندگی متاثر ہوتی ہے اور ان کے معاشیات پامال ہو رہے ہیں۔

فکری حریت کا بھی مغربی تصور یہی ہے کہ ہر شخص کو سوچنے اور اپنی رائے کے اعلان کرنے کی عام اجازت ہے بشرطیکہ وہ رائے آزادی اور آزادی کے بنیادی افکار کو متاثر نہ کر سکے اور یہی وجہ ہے کہ ڈیموکریسی والے معاشرے فاشستی افکار کو عام نہیں ہونے دیتے کہ ان سے ان کے بنیادی خیالات پر اثر پڑتا ہے اور یہ افکار ان کی اصل عمارت ہی کو منہدم کر دیتے ہیں۔

اسلام یہاں بھی مغرب سے مکمل اختلاف رکھتا ہے اور اس اختلاف کی بنیاد بھی وہی فطری اختلاف ہے جو اسلام اور مغربیت میں پایا جاتا ہے کہ مغربیت انسان کو پیدائشی طور پر آزاد تسلیم کرتی ہے اور اسلام اسے ایک خالق کی مخلوق اور ایک خدا کا بندہ سمجھتا ہے اس کی نظر میں ذاتی افکار کے اعلان پر اس وقت تک کوئی پابندی نہیں ہے جب تک عقیدۂ توحید متاثر نہ ہو اور انسان اپنی شخصیت کو خواہشات و اصنام کے حوالے نہ کر دے یا دوسرے

الفاظ میں یوں سمجھ لیجئے کہ افکار کے اعلان پر دونوں ہی جگہ پابندی ہے اور پابندی کی سرحدیں دونوں مقامات پر اپنے اپنے بنیادی افکار سے شروع ہوتی ہے ـــــ اسلام کی فکری آزادی کا ایک نمونہ یہ بھی ہے کہ اس نے اندھی تقلید کی شدید مخالفت کی ہے اور انسان کے اندر ایک استدلالی عقل اور منطقی ذہن پیدا کرنا چاہا ہے اس کا عقیدہ یہ ہے کہ فکری آزادی صرف اس بات میں نہیں ہے کہ انسان کو ہر طرح سوچنے کا اختیار دیدیا جائے چاہے وہ نتیجہ میں خواہش پرستی اور اندھی تقلید ہی تک کیوں نہ پہنچ جائے بلکہ حقیقی آزادی یہ ہے کہ فکر و نظر کی صلاحیت پیدا کی جائے، استدلال و منطق کا شعور بیدار کیا جائے، آبائی تقلید سے روکا جائے، رسوم و عادات کی بیجا پابندی سے نجات دلائی جائے اور خواہش کے مقابلہ میں عقل کی بنیاد پر سوچنے کا عادی بنایا جائے۔ یہی آزادی کا انقلابی تصور اور یہی حریت کا حقیقی مفہوم ہے، بیجا تقلید اور تعصب جیسے جذبات انسان کی آزادی فکر کو پامال کر دیتے ہیں ـــــ ارشاد ہوتا ہے

"ہمارے ان بندوں کو بشارت دیدو جو بات کو غور سے سنتے ہیں اور پھر جو اچھی ہوتی ہے اس کا اتباع بھی کرتے ہیں یہی وہ ہیں جن کی اللہ نے ہدایت کی ہے اور یہی وہ ہیں جو صاحبان عقل ہیں" (الزمر ۱۷-۱۸) "اے رسول ہم نے آپ کی طرف ذکر نازل کیا تاکہ آپ لوگوں سے بیان کریں شاید وہ اس طرح فکر کرنے لگیں" (النحل ۴۴) ـــــ "جب ان سے کہا جاتا ہے کہ خدائی تنزیل کا اتباع کرو تو یہ کہتے ہیں کہ ہم اپنے آباء و اجداد کی سیرت پر چلتے ہیں .... چاہے ان کے آباء و اجداد بالکل بے عقل و گمراہ رہے ہوں (بقرہ ۱۷۰) ـــــ "یہ ان لوگوں کے خیالات ہیں ان سے کہدو کہ اگر یہ سچے ہیں تو اپنے گواہ لے آئیں" ـــــ (بقرہ ۱۱۱)

ضمانت

اسلام اور مارکس ازم میں

اسلامی نظام کی ضمانت مارکس ازم کی ضمانت سے کئی اعتبار سے اختلاف رکھتی ہے جس کی بنیاد اساس، طریقہ کار اور مقصد کا اختلاف ہے، تفصیل کا موقع نہیں ہے اس لئے صرف ایک خاکہ پر نظر کی جاتی ہے۔

۱۔ اساسی اختلاف کا مفہوم یہ ہے کہ اسلامی قانون میں ضمانت ایک انسانی حق ہے جو بندے کے سر اللہ کی طرف سے فرض کیا گیا ہے اس میں نہ حالات سے فرق پیدا ہو سکتا ہے اور نہ تمدنی سطحوں سے۔ ذرائع پیداوار کسی منزل پر ہوں اور حالات کیسے ہی کیوں نہ ہوں ہر انسان دوسرے انسان کی زندگی کا بقدر امکان ضامن ہے برخلاف اشتراکیت کے کہ وہاں ضمانت کا تعلق ذرائع پیداوار سے ہے یہ ذرائع اگر ایک خاص مقدار تک ترقی کر جائیں تو عام ضمانت کا قانون نافذ ہوگا ورنہ نہیں ــــ یہی وجہ ہے کہ یہ قانون اشتراکیت کے ہر معاشرہ میں رائج نہیں ہوا بلکہ بہت سے معاشرے اس سے عاری رہے ہیں۔

۲۔ اسلامی نظام میں اجتماعی ضمانت کے رواج کا ذریعہ وہ احساس اخوت ہے جو پورے اسلامی معاشرے میں پایا جاتا ہے اور ہر ایک کو دوسرے کی زندگی کی حفاظت کی دعوت دیتا ہے۔ حدیث میں ہے کہ "مسلمان مسلمان کا بھائی ہے نہ اس پر ظلم کر سکتا ہے نہ اسے ترک کر سکتا ہے اور نہ محروم رکھ سکتا ہے...... مسلمانوں کا فرض ہے کوشش کریں، تعلقات پیدا کریں، ایک دوسرے کی مدد کریں اور اہل ضرورت سے ہمدردی کریں" ــــ لیکن مارکسیت میں اس کا

واحد ذریعہ طبقاتی نزاع ہے جس کے بعد ایک طبقہ فنا ہو جائے گا اور دوسرا طبقہ برسر اقتدار آجائے گا اور ضمانت کا قانون خود بخود نافذ ہو جائے گا۔ نہ کسی اخوت کی ضرورت پڑے گی اور نہ مواسات وہمدردی کی۔ اہل حکومت کا کام صرف یہ ہوگا کہ سماج کے ضعیف طبقہ کو قوی طبقہ سے ٹکرانے کے لئے تیار کریں اور اس نزاع کی رفتار کو تیز تر کر دیں تاکہ ضعیف طبقہ کی فتح کے بعد ضمانت کے اصول خود ہی سامنے آجائیں۔

۳۔ مقصد کے اعتبار سے دونوں کی ضمانت میں یہ فرق ہے کہ اسلامی دستور میں ضمانت ایک انسانی حق ہونے کے رشتے سے کسی ایک جماعت کے ساتھ مخصوص نہیں کی جاسکتی بلکہ یہ فائدہ ان لوگوں کو بھی پہونچے گا جو خود کسی پیداوار کے اہل نہیں ہیں اور معاشی تگ ودو میں معاشرے کے ساتھ چلنے کے قابل نہیں ہیں حکومت کا فرض ہے کہ ایسے لوگوں کی زندگی کی بھی ضمانت لے اور ان کے معاشیات کا بھی اہتمام کرے ــــــ لیکن مارکسیت میں ایسا کچھ نہیں ہے وہاں اصل طبقاتی نزاع ہے جس میں مزدور طبقہ کی فتح ہوگی، سرمایہ داری کا خاتمہ ہوگا اور تمام مزدوروں میں دولت حسب حصّہ تقسیم کر دی جائے گی کسی کی ضمانت کا کوئی سوال ہی نہ پیدا ہوگا اور یہی وجہ ہے کہ مارکسیت میں ان عاجز افراد کی زندگی کی کوئی ضمانت نہیں ہے جو مزدور طبقہ سے الگ ہیں اور خود کوئی کام کرنے سے عاجز ہیں اس لئے کہ انھوں نے طبقاتی جہاد میں کوئی حصہ نہیں لیا ہے اور جس نے جہاد نہیں کیا ہے اسے مال غنیمت سے کیا سروکار؟

۴۔ مارکسیت کی نظر میں معاشرتی ضمانت کا قانون صرف حکومت کی ذمہ داری ہے افراد سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے، لیکن اسلام میں یہ افراد اور حکومت دونوں ہی کی ذمہ داری ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس نے اس قانون کو دو حصّوں پر تقسیم کر دیا ہے ایک کفالت اور ایک ضمانت۔

کفالت کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کی ہر فرد دوسرے افراد کی زندگی
ذمہ دار ہے اور ایک مسلمان کے استطاعت رکھتے ہوئے دوسرے انسان کا
کرنا ناممکن ہے حالات کتنے ہی ناگفتہ بہ کیوں نہ ہو جائیں اس قانون کو بہر حال نا
کرنا پڑیگا، حکومت شرعیہ رہے یا نہ رہے خود افراد اس قانون پر عمل کرینگے، حدیث شریف
میں اعلان ہوتا ہے کہ "جس مومن نے بھی دوسرے مومن کو استطاعت و امکان رکھتے
ہوئے کوئی ضرورت کی چیز دینے سے انکار کر دیا اسے پروردگار روز قیامت اسطرح
اٹھائیگا کہ چہرہ سیاہ، آنکھیں نیلی اور ہاتھ پس گردن سے بندھے ہوئے ہونگے اور یہ کہا جائیگا
اس خائن نے اللہ و رسول کیساتھ خیانت کی ہے لہذا اسے جہنم میں جھونک دیا جائے"

ضمانت کا مفہوم یہ ہے حکومت سماج کی سطح کو بلند کرنے کی مکمل ذمہ دار ہے اس
فرض ہے کہ حکومت کی املاک کے مختلف ذرائع سے عوامی زندگی کی سطح کو بلند کرے اور
اسمیں کوئی کوتاہی نہ کرے — ارشاد ہوتا ہے کہ "والی کا فرض یہ ہے کہ مال کو لیکر ان تمام
وجوہ میں صرف کرے جنھیں پروردگار عالم نے معین کیا ہے، فقراء و مساکین، مولفۃ القلوب
عاملین کو دے غلاموں کی آزادی اور قرض داروں کی رہائی میں صرف کرے، فی سبیل اللہ
تعمیری کام کرے، غربت زدہ مسافروں کی امداد کرے، اتنا دے کہ وہ لوگ سال
بھر کے لئے مستغنی ہو جائیں اس میں کوئی تنگی اور تقیہ نہ کرے۔ اس کے بعد اگر کچھ
بچ جائے تو وہ والی کا ہے اور اگر کم پڑ جائے تو والی کی ذمہ داری ہے کہ اسے اپنے
پاس سے پورا کرے یہاں تک کہ وہ لوگ مستغنی ہو جائیں!

النجف الاشرف

محمد باقر الصدر

توضیحات مترجم

سرمایہ داری اور فلسفہ

مؤلف محترم نے اپنے بیانات میں اس بات کا دعویٰ کیا ہے کہ سرمایہ داری کا کوئی بنیادی فلسفہ نہیں ہے اس عبارت کا مفہوم یہ ہے کہ کوئی نظام زندگی اس وقت تک نظام نہیں کہا جا سکتا جب تک اس میں حیات و کائنات کے بنیادی مسائل حل نہ کر لئے گئے ہوں۔

سرمایہ داری نے آزادی کی آواز ضرور بلند کی ہے لیکن انسان کی حقیقت، حیات کی نوعیت اور تاریخ کی رفتار کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کیا۔ اس کا نظریہ مادی ضرور ہے لیکن اس نے مادیت کے بارے میں بھی کوئی رائے ظاہر نہیں کی۔

سرمایہ داری اور اسلام کا ایک نمایاں فرق یہی ہے کہ سرمایہ داری نے مادیت کو اپنا کر حیات کے جملہ مسائل کو نظر انداز کر دیا ہے اور اسلام نے حیات کو "خودرو پودے" کے بجائے ایک خالق و مالک کا عطیہ تسلیم کیا ہے۔ سرمایہ داری کی نظر میں آزادی انسان کا فطری حق ہے اور اسلام کی نظر میں مالک کا صدقہ۔ وہ انسان کو ہمہ جہت آزاد دیکھنا چاہتی ہے اور یہ مالک کی رضا کا پابند۔

اشتراکیت کو سرمایہ داری پر یہی فوقیت حاصل ہے کہ اس نے حیات و کائنات کے مسائل کو درخور اعتنا بنایا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ زندگی ایک شعلہ ہے جو از خود بھڑک اٹھتا ہے اور اپنی میعاد پوری کر کے بجھ جاتا ہے وہ کسی خالق و مالک کی معترف نہیں ہے اس کے یہاں نہ کسی ابتدا کا تصور ہے اور نہ انتہا کا۔ وہ نہ مبدء کی قائل ہے اور نہ معاد کی۔

اس کا کہنا ہے کہ تاریخ کی رفتار ایک جدلیاتی کیفیت رکھتی ہے۔ ہر سماج اپنے اندر اپنے مخالف جراثیم رکھتا ہے۔ جو دھیرے دھیرے پرورش پاتے رہتے ہیں اور ایک وقت پوری قوت سے موجودہ نظام پر حملہ کر کے اسے میدان عمل سے ہٹا کر اس کی جگہ پر قابض ہو جاتے ہیں۔

اشتراکیت پوری تاریخ انسانیت کی تحریک کا کام معاشیات کے حوالے کرتی ہے اس کا عقیدہ ہے کہ انسانی زندگی کے مختلف شعبوں میں صرف معاشیات ہی ایک شعبہ ہے جسے اساسی اور بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ باقی شعبے ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔ انسان کے فلسفی۔ مذہبی۔ اخلاقی خیالات معاشی حالات کے تابع ہوتے ہیں۔ جیسے جیسے وسائل پیداوار ترقی کرتے جائیں گے۔ معاشی حالات میں فرق پیدا ہوگا اور اسی فرق کے ساتھ سارے تصورات و رجحانات بدل جائیں گے۔

اسلام اور اشتراکیت میں ایک بڑا فاصلہ یہ بھی ہے کہ اشتراکیت سارے تصورات و مفاہیم کو اقتصادیات کا تابع سمجھتی ہے اور اقتصادیات کو ایک غیر جامد سیال حقیقت تسلیم کرتی ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ دنیا میں کوئی غیر متغیر اور ٹھوس حقیقت نہیں ہے نہ فلسفہ نہ مذہب۔ نہ اخلاق نہ ماورا طبیعیات۔ اور اسلام ایسے ٹھوس حقائق کا قائل ہے جن میں کوئی تغیر و تبدل ممکن نہیں ہے۔ اس نے آغاز کائنات سے پہلے ہی ایک غیر متغیر ہستی کا اقرار کیا ہے اور اسی پر اعتماد کر کے پورے نظام حیات کو مرتب کیا ہے اس کا عقیدہ ہے کہ دنیا کے سارے رجحانات معاشی حالات کے تابع نہیں ہیں بلکہ تاریخ میں متعدد عوامل و اسباب ایسے بھی ہیں جن کی بنیاد پر خود معاشیات کی گاڑی چل رہی ہے۔ وہ فلسفی افکار اور دینی عقائد کو جملہ معاشی حالات سے مافوق تصور کرتا ہے۔ وہ اس بات کو تسلیم کرنے پر راضی نہیں ہے کہ تاریخ کے کسی دور میں اجتماع ضدین ممکن ہو جائے۔ وجود و عدم ایک نقطہ پر

جمع ہوجائیں۔ دو اور دو کا مجموعہ پانچ ہوجائے اور توحید شرک سے بدل جائے۔
معاشی دنیا کے بیشمار انقلابات نہ ان ٹھوس حقائق میں کوئی تبدیلی پیدا کرسکے ہیں اور نہ آئندہ پیدا کرسکیں گے یہ اشتراکیت کا ایک خیال خام ہے اور بس۔

کفالت و ضمانت

معاشی میدان میں ایک بڑی دلچسپ بحث یہ بھی ہے کہ اس کائنات میں کس انسان کا کتنا حصہ ہے اور اور اس حصہ کی بنیاد کیا ہے۔ اشتراکیت کا خیال ہے کہ کائنات کا خام مادہ بالکل بے ارزش اور بے قدر و قیمت ہے۔ اس میں قیمت و قدر کا سلسلہ انسانی محنت سے شروع ہوتا ہے اس لئے جو انسان جتنی محنت کرے گا اور جس قدر قیمت پیدا کریگا وہ اس کا مالک کہا جائے گا۔ کسی دوسرے کو اس کی پیدا کی ہوئی قیمت میں حصہ بانٹ کرنے کا حق نہیں ہے اس کی نظر میں طبقاتی نزاع کا سارا فلسفہ یہی ہے کہ کارخانے کا مالک مزدور سے زیادہ قیمت پیدا کراتا ہے اور اسے کم اجرت دے کر باقی قیمت پر خود قبضہ کر لیتا ہے اور اس طرح سماج کے اندر ایک مالک و مزدور کی جنگ شروع ہوجاتی ہے کبھی مالک مزدور پر فتح پاتے ہیں اور سرمایہ دار نظام وجود میں آتا ہے اور کبھی مزدور مالک پر غالب آتا ہے اور اشتراکی معاشرہ جنم لیتا ہے۔
ظاہر ہے کہ اس فلسفے کی بنا پر ان افراد کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں ہے جو کام کرنے سے عاجز اور ملکی پیداوار میں کوئی اضافہ کرنے سے قاصر ہیں —— ان کے لئے نہ کوئی ضمانت ہے اور نہ ذمہ داری۔ حکومت اپنے پاس سے کوئی انتظام اس لئے نہیں کر سکتی کہ اس نظام میں حکومت کی املاک کا کوئی تصور نہیں ہے۔ حکومت صرف عوام کے حقوق کی محافظ ہے۔ اسے اپنی زندگی کی بقا سے زیادہ حصہ لینے کا کوئی حق نہیں ہے۔ وہ دوسرے کی کفالت کا بار کہاں سے اٹھا سکتی ہے —— !

اسلام کا معاشی فلسفہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ وہ انسانی جد و جہد اور بشری محنت کو پوری اہمیت دینے کے باوجود خام مواد کی قدر و قیمت کا قائل ہے اور اس قیمت کو خالق کائنات کا ایک عطیہ تصور کرتا ہے۔ اس کا عقیدہ ہے کہ دنیا کی ہر پیداوار میں ایک حصہ اس مزدور کا ہے جس نے اپنی محنت سے قدر و قیمت کا اظہار کیا ہے اور ایک حصہ اس خام مادہ کا ہے جس نے محنت کو باوقعت بنایا ہے ورنہ انسانی جد و جہد دریا سے پانی نکالنے سے زیادہ اہمیت کی حامل نہ ہوتی۔ وہ اس خام مادہ کو مالک کا عطیہ قرار دیتے ہوئے اس کی ملکیت کا حق اس جائز شرعی حکومت کو دیتا ہے جسے خلافت الٰہیہ کا درجہ حاصل ہے اور جسے خالق کائنات نے اپنے فطری عطایا پر مکمل تصرف کا حق دیا ہے۔ اس شرعی حکومت کی ذمہ داری ہے کہ قاصر و عاجز افراد کی زندگی کا انتظام کرے اور ساتھ ساتھ اپنے ذاتی املاک کے سہارے سماج کی معاشی سطح بھی بلند کرے۔ حکومت کی ذمہ داری صرف یہیں پر ختم نہیں ہوتی کہ سماج کے سارے افراد کو دو وقت کی روٹی اور سر چھپانے کی جگہ مل جائے بلکہ اس کی ایک بڑی ذمہ داری یہ بھی ہے کہ اپنی تنظیم خاص سے سماج کی معاشی سطح کو اونچی کرتی رہے اور عوام کو بہتر سے بہتر سامان حیات فراہم کرے۔

کفالت و ضمانت کا نمایاں فرق یہ ہے کہ افراد کی زندگی کی ذمہ داری صرف حکومت کے سر نہیں ہے بلکہ اس کا محاسبہ ان عوام سے بھی کیا جائے گا جن کے پاس سامان زندگی موجود تھا اور ان کا ہمسایہ فاقہ کر رہا تھا لیکن سماجی سطح کی بلندی کی مسئولیت صرف حکومت کے سر ہے۔ ولی امر کا فرض ہے کہ زکوٰۃ و صدقات کے مال سے فی سبیل اللہ رفاہ عام کا انتظام کرے اور

معاشرہ کو اس منزل تک پہونچا دے جہاں غربا و فقرا تلاش و جستجو کے بعد بھی ہاتھ نہ آسکیں ــــ!

مولائے کائنات حضرت علی بن ابیطالبؑ نے تخت حکومت سنبھالنے کے بعد اس حقیقت کا اعلان کیا تھا کہ ایک شخص کے فاقہ کرنے کا مطلب ہی یہ ہے دوسرے نے اس کے حق کو غصب کر لیا ہے ورنہ کائنات خدا میں کسی کے رزق کی کمی نہیں ہے اور میں کسی بھی ظالم کو اس وقت تک عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھ سکتا جب تک مظلوم کو اس کا حق نہ دلا دوں۔

فرمان علوی صاف آواز دے رہا تھا کہ حقیقی ولی امر عوامی کفالت و توازن کا ذمہ دار اور سماجی سطح کی بلندی کا محافظ و مسئول ہوا کرتا ہے۔

●

- خاندان کیا ہے اور اس کی تشکیل کیونکر ہوتی ہے ؟
- اسلام میں خاندان کا مرتبہ اور اس کے روابط کیا ہیں ؟
- نکاح و طلاق و میراث کے احکام کی بنیادیں کیا ہیں ؟

ان باتوں کو

ہماری آئندہ کتاب

عائلی زندگی اور اسلام

میں ملاحظہ فرمائیے

ھدیہ -/2

آئندہ پیشکش

عائلی زندگی اور اسلام
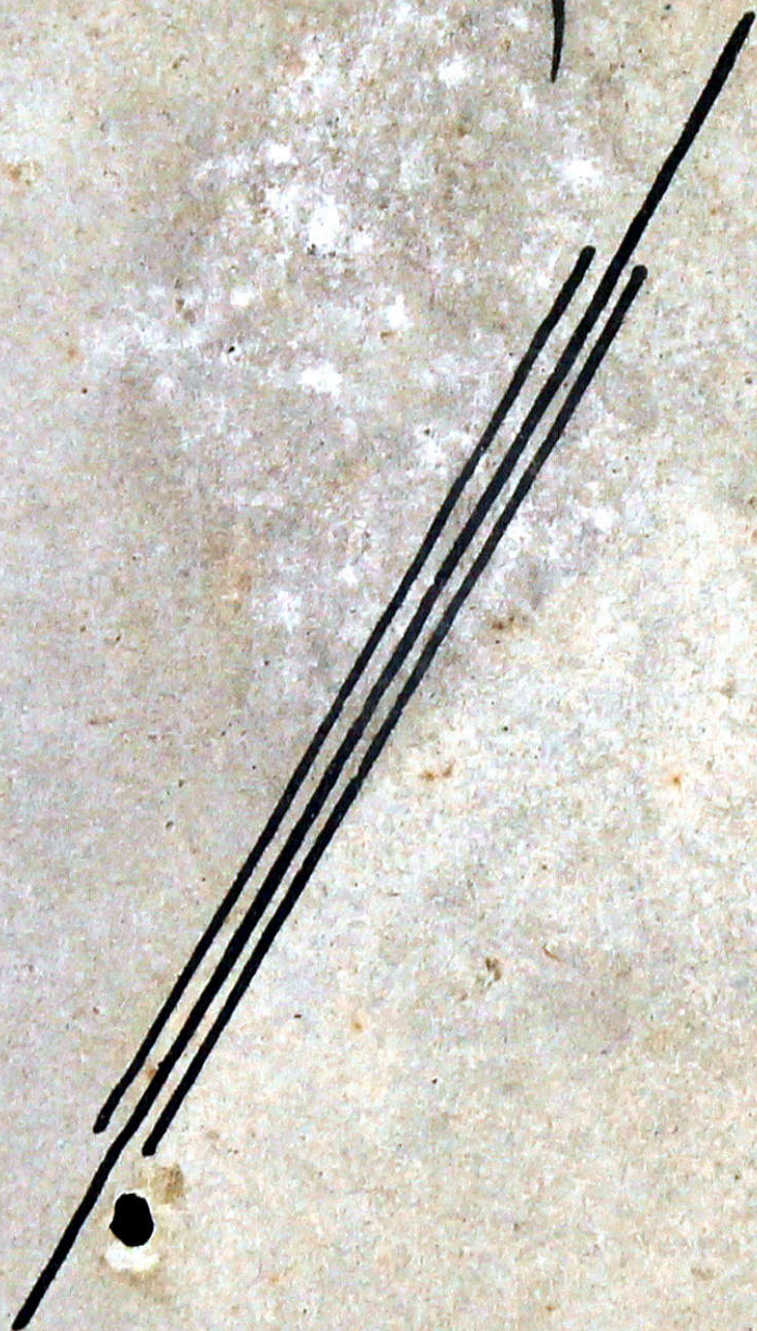
علامہ السید ذیشان حیدر جوادی

فیلسوف الشرق السید محمد باقر الصدر

۴

اجتماعی مشکلات اور انسان

ترجمہ

علامہ السید ذیشان حیدر جوادی

ناشر:
ادارہ نشر و اشاعت
مسجد قاضی صاحب بخشی بازار
الہ آباد

1/=

اجتماعی مشکلات
اور
انسان

باسمہٖ سبحانہٗ

ہمارے ادارے کی چوتھی پیشکش آپ کے سامنے ہے۔ اتنے مختصر عرصے میں اتنی کتابوں کا پیش کر دینا مذہبی اداروں کی تاریخ میں بینظیر نہیں تو کم نظیر ضرور ہے اور یہ سب صرف آپ کی حوصلہ افزائی اور مذہبیات سے دلچسپی کا نتیجہ ہے۔

زیر نظر کتاب نجف اشرف کے جلیل القدر مفکر حجۃ الاسلام السید محمد باقر الصدر دام ظلہ کے زریں افکار کا ایک نمونہ ہے جسے اُردو زبان کے سانچے میں ڈھالنے کا کام سرکار علامہ جوادی نے انجام دیا ہے۔

کتاب کیا ہے؟ اس کا فیصلہ آپ کے مطالعہ پر موقوف ہے۔

ناشر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حرف آغاز

خالق کائنات نے انسان اور حیوان کی خلقت میں ایک نمایاں فرق یہ رکھا ہے کہ انسان کو جسم و روح دونوں کا مجموعہ بنا کر روح کو قوت عقل و ادراک عطا کر دی اور روح حیوانی کو مسائل ادراک سے مستثنیٰ کر دیا جس کے بعد حیوان نفس ناطقہ کے جملہ لوازم و ضروریات سے بے نیاز ہو گیا اور انسان فطری طور پر ان باتوں کا بھی نیازمند رہ گیا۔

دوسری بات یہ بھی ہے کہ حیوان کو اس کے جملہ ضروریات میں خود کفیل بنایا گیا ہے اس کے جسم کی ساخت ایسی ہے کہ اسے نہ پہننے کے لئے لباس کی ضرورت ہے اور نہ رہنے کے لئے مکان کی ـــــ غذا بھی اتنی سادہ ہے جس میں کسی تعمیر و ترتیب کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ فطرت کے سادہ نمونوں سے فائدہ اٹھاتا ہے اور اپنی دستکاری کو کوئی دخل نہیں دیتا۔

جہد حیات کے جملہ اسباب بھی اس کے پاس ذاتی طور سے موجود ہیں وہ نہ حملہ کرنے کے لئے اسلحہ کا محتاج ہے اور نہ دفاع کے لئے سپر و زرہ کا۔ اسکے اعضاء و جوارح ہی اس کے اسلحہ ہیں اور اس کا جسم ہی اس کی سپر ہے جس کی وجہ سے وہ تنہائی میں بھی زندگی گذار لینے کے امکانات رکھتا ہے۔

لیکن انسان ان تمام پہلوؤں سے محتاج و بے بس۔ ناتوان و نیازمند ہے۔ اس کی روح ادراک و احساس اور عقل و فہم کے مسائل کی متقاضی ہے۔ اس کا جسم سرد و گرم زمانہ سے تحفظ کے لئے لباس چاہتا ہے اور سکون و اطمینان کے لئے مکان ـــــ اس کی غذا بھی فطرت کی خالص دین نہیں ہے بلکہ دستِ بشر کی صنعتوں کا نتیجہ ہے ـــــ اس کی زندگی کے لئے زراعت بھی درکار ہے اور صناعت بھی ـــــ تجارت بھی لازم ہے اور ملازمت بھی ـــــ درس و تدریس بھی ناگزیر ہے اور تعلیم و تعلم بھی ـــــ مذاکرات بھی ضروری ہیں اور تبادلۂ خیالات بھی۔ اور کھلی ہوئی بات ہے کہ یہ سارے کام تنہائی میں انجام نہیں دیئے جا سکتے۔ اس کے لئے ایک پوری جماعت اور برادری کی ضرورت ہے جو تقسیم کار کے اصول پر اسباب حیات فراہم کرے اور پھر متوازن اصولوں پر اسے تقسیم کر لیا جائے۔ ایک کی زراعت دوسرے کی غذا کا سامان فراہم کرے اور دوسرے کی صنعت اسکے تحفظ جسم کے کام آئے۔ ایک کی تعمیر مکان تیار کرے تو دوسرے تعمیر لباس و غذا۔

فطرت اجتماع

لوازم حیات کے علاوہ خود انسانی فطرت بھی اجتماع پسند ہے اور وہ فطری اعتبار سے کسی وقت بھی اجتماع سے رشتہ نہیں توڑ سکتا۔ انسان اور حیوان کا ایک بنیادی فرق یہ بھی ہے کہ دونوں توالد و تناسل میں مشترک ہونے کے باوجود اس امتیاز کے حامل ہیں کہ حیوان کا مسئلہ تناسل صرف فطری ہوتا ہے اس میں کسی اختیار و انتخاب کو دخل نہیں ہوتا اور انسان کے لئے یہ سارے اسباب اپنے اختیار و انتخاب سے مہیا کئے جاتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حیوان جنسی رابطہ کے بعد ایک دوسرے سے بیگانہ ہو جاتا ہے اور انسان ایسا نہیں ہو سکتا ـــــ حیوان کا بچہ پیدا ہونے کے بعد صرف اپنے سماج کا ایک جزء بن جاتا ہے اس کا کوئی نسبی سلسلہ نہیں ہوتا اور انسان

ایسا نہیں ہے ۔۔۔!

توالد و تناسل کی یہی اختیاری شان تھی جس نے انسان کو سبب و نسب کے شکنجوں میں جکڑ دیا۔ اب وہ پیدا ہوتے ہی ایک ماں باپ کا بیٹا ہوتا ہے تو ایک بھائی بہن کا بھائی ۔۔۔ ایک ماموں کا بھانجہ ہوتا ہے اور ایک چچا کا بھتیجا ۔۔۔ اور قیامت یہ ہے کہ جیسے جیسے معاشرہ میں آگے بڑھتا جاتا ہے ان روابط و تعلقات میں اضافہ ہی ہوتا جاتا ہے۔ وہ کسی دوست کا دوست ہوتا ہے اور کسی ہمنشین کا ساتھی ۔۔۔ کسی حکومت کا محکوم ہوتا ہے اور کسی استاد کا شاگرد ۔۔۔ زمان و مکان اور قوم و صنف کے روابط اس کے علاوہ ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ انسان بیشمار روابط اپنے ہمراہ لیکر آتا ہے اور ان پر لاتعداد روابط کا روز افزوں اضافہ ہوتا رہتا ہے اور وہ اپنے ادراک و احساس۔ انتخاب و اختیار۔ فکر و نظر۔ عقل و فہم کی بناء پر ان روابط سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔

تقاضائے فطرت

فطرت انسان و حیوان کا ایک فرق یہ بھی ہے کہ فطرت حیوان صرف مادی غذاؤں کی طلب گار ہے اسے نہ روحانی غذا درکار ہے اور نہ روابط و تعلقات کی بقا۔ لیکن انسان اس سے بالکل مختلف ہے۔ وہ ایک طرف جسم و روح کی بقا و راحت کے لئے غذا چاہتا ہے تو دوسری طرف روابط و تعلقات کی بقا کے اسباب کا متقاضی ہے وہ یہ جانتا ہے کہ غذا کے بغیر نہ جسم و روح کی بقا ہے اور نہ روابط و تعلقات کی۔ اسے یہ بھی معلوم ہے کہ جس طرح غذا کے بغیر جسم مُردہ ہو جاتا ہے اسی طرح حسن سلوک کے بغیر رشتہ و روابط بھی مُردہ کے حکم میں داخل ہوتے ہیں ۔۔۔ اس لئے اس کا فطری فرض ہے کہ وہ جسم و روح کے ساتھ ان رشتوں کے بقا کا بھی انتظام کرے اور انھیں مُردہ نہ ہونے دے۔ اور کھلی ہوئی بات ہے کہ یہ

کام تنہائی و وحشت کے ساتھ سازگار نہیں ہے جس کا مقصد ہی یہ ہے کہ فطرت نے انسان کو اجتماعی اور جماعتی بنایا ہے وہ انسانوں میں باہمی جدائی نہیں برداشت کرنا چاہتی ــــ !

فطرت کی اجتماعیت ہی کا اثر تھا کہ سارے حیوانات کو ہمرنگ و ہم آواز بنانے کے بعد انسان کے صوت و رنگ میں فرق پیدا کر دیا گیا ہے۔ آپ دنیا میں جہاں بھی چلے جائیں۔ جانور کی ہر صنف کو ایک ہی شکل و صورت اور ایک ہی صوت و آہنگ کا پائیں گے لیکن انسانوں کی ہر صنف میں شکل و صورت اور طرز و انداز کا نمایاں فرق نظر آئیگا جس کا بنیادی راز یہی ہے کہ قدرت نے انسان کو اجتماعی روابط و مسائل کے لئے پیدا کیا ہے اور حیوانات کو انسانوں کے وسائل حیات فراہم کرنے کے لئے خلق کیا گیا ہے۔

اجتماعی روابط کے لئے فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ انھیں باقی رکھا جائے اور ان کی غذا پہونچا کر ان کی زندگی کے وسائل فراہم کئے جائیں۔ دنیا کا کوئی ربط غذا کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ زندگی بہر حال غذا کی طالب ہے۔ یہ اور بات ہے کہ جسم و رُوح کی غذا اور ہے اور روابط و تعلقات کی غذا اور ــــ جسم و روح کا مسئلہ انفرادی ہے اور روابط کا مسئلہ اجتماعی ــــ انفرادی مسائل سکون و اطمینان چاہتے ہیں اور اجتماعی مسائل باہمی توازن ــــ اور توازن کو برقرار رکھنے کے لئے نسبی۔ سببی۔ صنفی۔ قومی۔ حکومتی۔ جیسے جملہ اقسام کے مسائل پر غور کرنا پڑتا ہے۔

انسان میں جملہ خوبیوں کے بعد ایک عظیم کمزوری یہ پائی جاتی ہے کہ انسان اپنے مفاد کا طالب اور اپنے مصالح کا پرستار ہے۔ کوئی انسان اپنے مفاد کو قربان کر کے دوسرے کو فائدہ پہونچانے پر راضی نہیں ہے ــــ مذہبی دنیا میں کار خیر بھی

اپنے ہی فائدہ کے لئے ہوتا ہے۔ عمل کرنے والے کو اگر یہ معلوم ہو جائے کہ نتیجہ میں ثواب واجر حاصل ہونے والا نہیں ہے تو کبھی عمل کرنے پر آمادہ نہ ہوگا۔

"حب نفس" کا جذبہ انسانی جذبات میں سب سے زیادہ بنیادی اور گہرا جذبہ ہے۔ ایسے حالات میں اگر اجتماعی روابط کے بارے میں ہر انسان کو آزاد کر دیا جائے تو کوئی انسان اپنے مفاد سے ہٹ کر سوچنے پر آمادہ نہ ہوگا اور سارا معاشرہ چند لمحوں میں موت کے گھاٹ اتر جائے گا۔ ضرورت ہے کہ اجتماعی روابط کو زندہ رکھنے کے لئے ایک عمومی قانون تیار کیا جائے جس کی روشنی میں تمام رشتوں کا توازن برقرار ہو اور کوئی فرد دوسرے پر ظلم نہ کرنے پائے

قانون کے لئے ایک دشواری یہ بھی ہے کہ اس کے بنانے والے بھی اس جذبہ سے بالاتر نہیں ہوتے اسلئے اس کی کوئی ضمانت نہیں ہے کہ ان کے بنائے ہوئے قانون میں یہ جذبہ شامل نہ ہوگا اور وہ اپنے مصالح سے ہٹ کر قانون بنائیں گے۔ اس لئے اصل قانون کی ضرورت کے ساتھ اس امر کی بھی ضرورت ہے کہ اس قانون کے مرتب کرنے کا کام ایسے ہاتھ میں دیا جائے جہاں حب نفس۔ خواہشات۔ منافع اور مصالح کا گذر نہ ہو جس کے لئے ساری کائنات کا مفاد یکساں حیثیت رکھتا ہو اور کسی کے فائدہ یا نقصان سے اسکی ذات پر کوئی اثر نہ پڑے

اسلام ایسے ہی ایک قانون کا حامی ہے جس کا وضع کرنے والا بشری نزل سے بالاتر اور خالق بشر ہونے کی صفت سے متصف ہے اس کا مدعا یہ ہے کہ قانون سازی کا کام مخلوق کے بجائے خالق کے حوالے کیا جائے تاکہ اس کی عظمت واہمیت، تمام افراد نوع کے لئے یکساں حیثیت کی حامل ہو لیکن دوسرے انسانوں نے اپنے افکار وآراء پر اعتماد کر کے خود قانون زندگی وضع کئے ہیں اور انھیں قوانین کی بنا پر اجتماعی توازن قائم کرنا چاہا ہے۔

زیر نظر کتاب میں انھیں قوانین کا تجزیہ کیا گیا ہے اور یہ دیکھا گیا ہے کہ یہ قوانین اجتماعی حالات کا واقعی حل بن سکتے ہیں یا نہیں۔ مؤلف محترم اپنی اس کوشش میں یقیناً کامیاب ہوئے ہیں لیکن کتاب کے مطالعہ کے لئے یہ ضروری ہے کہ اسے افسانہ و ناول سمجھ کر نہ دیکھا جائے بلکہ انسانی زندگی کا بنیادی مسئلہ سمجھ کر مطالعہ کیا جائے تاکہ مؤلف کی زحمتوں کا بھی اندازہ ہو اور ایک صحیح و صحت مند سماج کا تصور بھی صفحۂ ذہن پر اُبھر سکے

مؤلف محترم کی عظمت کے بارے میں کچھ کہنا آفتاب کو چراغ دکھانے کے مرادف ہے۔ آپ کی شخصیت صرف نجف و عراق میں نہیں بلکہ پوری دنیائے علم و اسلام میں جانی پہچانی ہوئی ہے ـــــ مفکرین اسلام آپ کو عالم عربیت کا تیسرا اور عالم اسلام کا چوتھا مفکر تسلیم کرتے ہیں اور آپ کے افکار کو انتہائی عظمت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ میں نے مدتوں آپ کی شاگردی کا شرف حاصل کرکے آپ کے نظریات و خیالات کا بہت قریب سے مطالعہ کیا ہے۔ آپ کی فلسفیانہ عظمت اور عالمانہ برتری کے ثبوت کے لئے دو عظیم تالیفات "ہمارا فلسفہ" اور "ہمارے معاشیات" کافی ہیں جن میں آپ نے دنیا کے فلسفوں کا اسلامی فلسفہ سے موازنہ کیا ہے اور دنیا کے معاشی نظاموں کے مقابلہ میں اسلام کے معاشی نظام کی برتری کو ثابت کیا ہے۔ دوسری کتاب کا اُردو ترجمہ میرے ہی قلم سے منظر عام پر آچکا ہے اور خدا نے چاہا تو پہلی کتاب کا ترجمہ بھی جلد ہی منظر عام پر آجائے گا۔

آپکی ایک کتاب "فدک تاریخ کی روشنی میں" کا ترجمہ بھی اسی ہندوستان میں شائع ہو چکا ہے ـــــ ابھی حال میں آپ نے ایک کتاب "بنیک کا غیر سودی نظام" حکومت کویت کی فرمائش پر لکھی ہے جو دنیا بھر کے علماء اسلام کے تالیفات کے مقابلہ میں منتخب کی گئی اور کویت میں باقاعدہ نشر کی گئی۔ اس کتاب کا ترجمہ بھی زیر غور ہے۔ حالات نے اجازت دی تو تھوڑے ہی عرصہ میں منظر عام پر

آجائے گا ــــ!

آج کل آپ کی توجہ علم منطق و فلسفہ کے اُلجھے ہوئے مسائل کی طرف ہے اور آپ نے منطق قدیم میں "حساب احتمالات" کے ایک نئے باب کا اضافہ کیا ہے جس پر دنیا کی دوسری زبانوں میں بھی بہت مختصر کام ہوا ہے۔ آپ کی کتاب یورپ اور ایشیا دونوں قسم کے ممالک کے علمی مراکز میں مرکز نظر بنی ہوئی ہے۔

نجف اشرف میں آپکا شمار درجہ اوّل کے علماء میں ہوتا ہے۔ اسلامی فقہ و اصول میں بھی آپ منفرد افکار کے حامل ہیں اور آپ نے ان میدانوں میں بھی نئے راستے قائم کئے ہیں۔ خداوند عالم سرکار موصوف کے سایہ کو ہمارے سروں پر قائم رکھے اور ان کے علمی افادات سے فائدہ اٹھانے کی توفیق عطا فرمائے۔

والسلام

جوادی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"آج کا انسانی مسئلہ"

دورِ حاضر کا وہ اہم مسئلہ جس نے انسانی فکر کو پراگندہ کر دیا ہے اور جس کا تعلق انسانی زندگی کی گہرائیوں سے ہے ——— "ایک ایسے نظام کی تلاش ہے جو انسانیت کے لئے صالح اور اجتماعی زندگی کے لئے موزون و مناسب ہو"؟

یہ مسئلہ جہاں ایک عظیم اہمیت کا حامل ہے اور اپنے حل و جواب کے لئے بے انتہا ذہنی کاوشوں کا طالب ہے وہاں بڑی حد تک خطرناک بھی ہے اس لئے کہ اس کا تعلق انسان کی ذات سے ہے اور اس کے حل کی ہر غلطی براہ راست انسانی معاشرہ پر اثر انداز ہوگی۔

انسانیت کی تاریخ گواہ ہے کہ عہدِ ماضی میں اس مسئلے کی جڑیں بہت دور تک پھیلی ہوئی ہیں اور انسان نے اس کے حل کے لئے اس وقت سے جد و جہد شروع کی ہے جب انسانی آبادی چند آدمیوں میں محدود تھی اور ان کی زندگی چند محدود تعلقات پر بسر ہو رہی تھی لیکن اس وقت بھی ایک ایسے نظام کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی جو ان تعلقات کی حد بندی کر کے معاشرہ کو متوازن راہوں پر چلا سکے۔

دراصل اس مسئلے نے فکر و سیاست کے میدان میں انسان کو ایک جہد مسلسل اور

جہاد پیہم میں مبتلا رکھا ہے اور ہر دور کے انسان نے اپنے عقل و فکر کے مطابق اس کے حل تلاش کئے ہیں، مختلف عقلی مذاہب عالم وجود میں آئے، ان کے خطوط معین ہوئے ان کی بنیادیں استوار کی گئیں اور اس کے بعد وہ مذاہب رہسپار ملک عدم ہو گئے۔ انسانیت کے حصہ میں مظالم آئے اور مصائب، مسکراہٹیں آئیں اور آنسو، نیک بختی آئی اور بدبختی۔ یہی ملے جلے تجربے تھے جو ہر دور کے انسان کو ملتے رہے ـــــ حسن اتفاق کہئے یا خوبی تقدیر کہ ہر دور میں کچھ روشنیاں ملتی رہیں اور کچھ باصلاحیت ذہن صفحہ تاریخ پر ابھرتے رہے ورنہ انسانیت اسی دائمی عذاب میں مبتلا رہ جاتی اور معاشرہ الفیں موجوں کی زد پر تھپیڑے کھاتا رہتا۔

مجھے اس وقت اس میدان میں انسانی جہاد کی تاریخ دہرانی نہیں ہے اور نہ میں ماضی کی الم انگیز داستان کو دہرانا چاہتا ہوں ـــــ میرا مقصد تو دور حاضر کے حالات کا جائزہ لینا ہے اور اس آخری مرکز کی طرف توجہ دینا ہے جہاں تک انسان اپنی مسلسل کوششوں کے بعد پہونچ سکا ہے اور جس سے یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ ابھی کتنے چکر اور باقی ہیں اور ساحل کا طوفان سے فاصلہ کیا ہے؟ وہ ساحل جہاں سلامتی کا مرکز ہو، اطمینان کا مستقر ہو اور عدل و خوش بختی کی حکومت

حقیقت یہ ہے کہ انسانی اجتماع کے مشکلات کا احساس جس قدر آج کے انسان کو ہے اتنا تاریخ کے کسی دوسرے دور میں ہرگز نہ تھا اسلئے کہ آج کا انسان موقف کی پیچیدگیوں کو کل سے زیادہ سمجھنے لگا ہے اور اب اسے یہ احساس بھی ہو گیا ہے کہ یہ مسئلہ اسی کا پیدا کیا ہوا ہے، اجتماعی قانون اسکے اوپر آسمان سے نہیں لادا جاتا اسکی حیثیت فطری قوانین کی نہیں ہوتی۔ وہ زمین کی جاذبیت کی طرح کوئی ایسا قانون نہیں ہے جس کے آگے وہ بالکل بے بس اور بے اختیار ہو جبکہ کل کا انسان بالکل یہی احساسات رکھتا تھا اور وہ ان قوانین کے سامنے اپنے کو بالکل بے بس سمجھتا تھا۔

(اس کا خیال تھا کہ یہ جاگیردارانہ نظام، یا غلامی کے قوانین آسمانی مقدرات ہیں جنکے آگے انسان اتنا ہی مجبور ہے جتنا آفتاب و ماہتاب کے آگے ــــ وہ نہ آفتاب کی گرمی کو سردی سے بدل سکتا ہے نہ جاگیردارانہ نظام کو سرمایہ دارانہ بنا سکتا ہے ــــ نہ ماہتاب کی خنکی چھین سکتا ہے نہ آقاؤں سے انکی آقائی سلب کر سکتا ہے ــــ لیکن آج کے انسان نے یہ محسوس کر لیا ہے کہ ایسا کچھ نہیں ہے بلکہ میرے دست و بازو میں اتنی طاقت ہے کہ میں انقلاب برپا کر کے ہر نظام کا جنازہ نکال سکتا ہوں اور معاشرہ کے لیے دوسرے نظام کو بھی مرتب کر سکتا ہوں ــــ مترجم)

آج کا انسان جہاں سپردگی کی منزل سے نکل کر جہاد و انقلاب کی راہوں پر چل رہا ہے وہاں مادیات اور طبیعات کی گوناگوں ترقیوں نے اسکی فکر کو اور بھی پراگندہ کر دیا ہے۔ آئے دن نئی نئی ایجادات عالم ظہور میں آ رہی ہیں۔ روزانہ نئے ذرائع پیداوار وجود پا رہے ہیں اور ہر ایجاد کے ساتھ سماجی تنظیم کے لئے ایک نئی مشکل ابھر تی آ رہی ہے اور اتنی بڑی پیداوار کی تقسیم ایک بھیانک مسئلہ کی شکل اختیار کرتی جا رہی ہے ــــ یہ اور بات ہے کہ اس کے ترکے میں اسلاف کے تجربے بھی ملے ہیں اور اس نے ان تجربات سے کافی فائدے بھی اٹھائے ہیں، چنانچہ اس اجتماعی مسئلے کو حل کرنے کے لئے بھی اس نے انھیں سابق تجربات کی روشنی میں کئی قدم اٹھائے ہیں جن میں کا ہر قدم ہمارے مذکورہ بالا سوال کا جواب بنا ہے ــــ" وہ کون سا اجتماعی نظام ہے جو انسانیت کیلئے صالح اور انسانی زندگی کیلئے موزوں و مناسب ہو گا؟

انسانیت اور مسئلہ کا حل

اجتماعی زندگی کے بنیادی مسئلے کو سمجھ لینے کے بعد ہمیں یہ دیکھنا پڑے گا کہ آج کا انسان اس مسئلے کو حل کرنے کے لئے کتنی استعداد و صلاحیت رکھتا ہے اور

وہ کن کن شرائط و لوازم سے آراستہ ہے تاکہ صحیح طور پر یہ اندازہ ہو سکے کہ اس کے جواب میں کتنا وزن ہو سکتا ہے ــــــ مثال کے طور پر ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ انسانی سماج کیلئے سرمایہ دارانہ نظام زیادہ مناسب ہے یا اشتراکیت' تو پہلے ان عناصر سے بحث کرنا پڑے گی جنکی بنیاد پر مناسب اور نامناسب کا فیصلہ کیا جائے پھر ان اصول و قوانین پر غور کرنا پڑے گا جن کے بغیر کوئی نظام صالح و مناسب ہو ہی نہیں سکتا ــــــ اور ان تمام منزلوں سے گذرنے کے بعد یہ دیکھنا ہو گا کہ آیا صالح نظام کا دریافت کرلینا اس کی تطبیق اور اس کے رواج کے لئے کافی ہو گا یا رواج و نفاذ کے لئے کچھ اور بھی شرائط ضروری ہیں جو بسا اوقات ان لوگوں کو بھی میسر نہیں ہو سکتے جو اپنی ذہنی صلاحیت کی بنا پر صالح نظام کے دریافت کی قدرت رکھتے ہیں ــــــ اور کھلی ہوئی بات ہے کہ یہ بات بڑی حد تک ایک فلسفی بحث سے مربوط ہے جسکا عنوان ہے! یہ انسانی اجتماع کیا ہے؟ ــــ اس کائنات سے اس کا رابطہ کیا ہے ــــ؟ انسان کے داخلی و خارجی محرکات کیا ہیں ــــــ؟ انسانی زندگی کن عناصر سے قائم ہوتی ہے؟ ــــ سماجی زندگی کے لئے کن باتوں کی ضرورت پڑتی ہے؟ ــــ تاکہ ان سب کی روشنی میں دیکھا جائے کہ کس نظام میں رواج و نفاذ کی صلاحیت ہے اور کس میں نہیں ہے۔

مارکس ازم

مارکسیت کا خیال ہے کہ انسان فکر و نظر کے اعتبار سے اپنے دور کے ذرائع پیداوار کا پابند ہوا کرتا ہے وہ ان ذرائع سے الگ ہو کر سوچنے سمجھنے کی کوئی صلاحیت نہیں رکھتا۔ صالح نظام کی فکر بھی اس کے ذہن میں اسی سماج کی پیداوار ہو گی جس میں وہ زندگی بسر کر رہا ہے، مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ ہوائی چکی نے اس کے ذہن میں یہ بات ڈالی تھی کہ جاگیردارانہ نظام صالح نظام ہے ــــــ بھاپ کے دور نے یہ فکر

پیدا کی کہ سرمایہ دارانہ نظام زیادہ صالح ہے۔ اب ذراتی اور برقی طاقتیں یہ القاء کر رہی ہیں کہ صحیح و صالح نظام صرف اشتراکیت ہے گویا کہ صالح نظام کا ادراک دوسرے الفاظ میں ذرائع پیداوار کے ادراک کا مترادف ہے جیسے جیسے ذرائع پیداوار کا ادراک بڑھتا جائے گا ویسے ویسے صالح سے صالح تر نظام کا ادراک پیدا ہوتا جائیگا۔

رہ گئی نظام کے صالح ہونے کی ضمانت کی بات۔ ! تو اس کی واحد ضامن و ذمہ دار وہ تاریخ ہے کہ جس کی حرکت ہمیشہ آگے کی طرف ہوتی ہے اور جو ہمیشہ اپنے ہر موڑ پر ایک ترقی یافتہ شکل پیش کرتی ہے اس لئے نظام کا تازہ ہونا ہی اس کی صحت و درستی کا واحد ذمہ دار ہے —— یہ اور بات ہے کہ بعض فکریں بعض اوقات تازہ معلوم ہوتی ہیں اور تھوڑے ہی دن میں یہ انکشاف ہو جاتا ہے کہ یہ بات کسی پرانی فکر کی صدائے بازگشت تھی جس نے نیا روپ دھار کر سماج کو دھوکہ دیا تھا جیسے کہ ہٹلر ازم کا حال تھا کہ وہ بظاہر نئی بات تھی اس لئے سماج اسے صالح سمجھ رہا تھا لیکن تھوڑے ہی دنوں میں واضح ہو گیا کہ یہ فکر صالح ہونے کے بجائے مفسد اور تباہ کن ہے —— !

رواج و نفاذ کے مرحلے میں مارکسیت کا عقیدہ ہے کہ نظام کا صالح اور انسب ہونا اس کے رواج کا ذمہ دار نہیں ہے اور نہ رواج کوئی مکمل تاریخی جبر ہے بلکہ اس کے لئے ضروری ہے کہ اس فکر کے پرستار اکثریت میں ہوں۔ سماج پر ان کا غلبہ و قبضہ ہو، ان کی آواز سننے کے قابل ہو تاکہ اس طرح مرحوم نظام کے پرستاروں سے ٹکر لی جا سکے اور جدید نظام کو رائج کیا جا سکے، محل بحث میں یوں کہا جائے کہ اشتراکی نظام کے رواج کے لئے مزدور طبقہ کا غلبہ و اقتدار انتہائی ضروری ہے جب تک یہ طبقہ اتنا اثر و رسوخ نہ پیدا کر لے کہ سرمایہ دارانہ ذہنوں کا استیصال کر سکے اس وقت تک اشتراکی نظام کے

رواج کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

درحقیقت مارکسیت کا یہ سارا فلسفہ اس کے "مادیت تاریخ" کے نظریہ پر قائم ہے جس کی تفصیلی تردید ہماری کتاب "ہمارے اقتصادیات" میں کی جا چکی ہے یہاں پر صرف اتنا اضافہ کرنا ہے کہ خود تاریخ بھی اس نظریہ کی ساتھی نہیں ہے بلکہ وہ بھی صالح نظام کی تشکیل میں ذرائع پیداوار سے ہٹ کر انسان کو ایک مستقل حیثیت دیتی ہے اور اس کا بیان ہے کہ انسان نے ہر دور میں اپنی فکری اور عقلی صلاحیتوں کی بنیاد پر صالح نظام کی تشکیل کی ہے چاہے اس دور کے ذرائع پیداوار کچھ بھی رہے ہوں چنانچہ خود قومی ملکیت، اشتراکیت، حکومتی ملکیت کے نظریات بھی تاریخ کے سابق ادوار میں منظر عام پر آچکے ہیں جب کہ ذرائع پیداوار کے اس حد تک ترقی کرنے کا کوئی امکان بھی نہ تھا، میں نہیں سمجھ سکتا کہ مارکسیت اس دور کے نظام کی کیا تاویل کرے گی ——— تاریخ گواہ ہے کہ افلاطون خود بھی اشتراکیت کا دلدادہ تھا، اس نے جس "مدینہ فاضلہ" کا تصور پیش کیا تھا اس کی بنیاد بھی اشتراکیت پر تھی تو کیا اس ترقی یافتہ فکر کو بھی ترقی یافتہ ذرائع پیداوار کا نتیجہ قرار دیا جا سکتا ہے؟

یہی نہیں بلکہ اشتراکیت کی فکر آج سے تقریباً دو ہزار برس پہلے بعض مفکرین کے ذہنوں میں اس قدر راسخ ہوگئی تھی کہ انھوں نے اسے اپنے دور پر منطبق بھی کیا تھا اور اس کے اثرات کا مشاہدہ بھی کیا تھا۔ چنانچہ چین میں ہان خاندان کا عظیم فلسفی وو۔ دی اشتراکیت کو باقاعدہ طور پر صالح نظام زندگی سمجھتا تھا اور اس نے ۱۴۰ سنہ ۸۷ ق۔ م تک اسے منطبق بھی کیا تھا۔ طبیعی پیداوار امت کی ملکیت بن گئی تھی۔ نمک، لوہا اور شراب کی صنعتوں کو قومی ملکیت قرار دیدیا گیا تھا حکومتی پیمانے پر حمل ونقل کے ایسے ذرائع پیدا ہو گئے تھے جن سے اوسط

درجے کے تاجروں کی تجارت کا خاتمہ ہو جائے اور تجارت صرف حکومتی پیمانے پر ہو
تاکہ غنیمت مواقع پر زیادہ قیمتیں نہ بڑھائی جا سکیں۔ حکومت کے ملازمین تمام شہروں
میں مال سپلائی کرتے تھے، ارزانی کے دور میں خریدتے تھے اور گرانی کے دور میں عوام
سہولت کا لحاظ رکھتے ہوئے فروخت کر دیتے تھے، بڑے بڑے کارخانے اسی
بنیاد پر کھول دیئے گئے تھے کہ انفرادی طور پر کاروبار کرنے والے اس کارخانہ میں کام کر سکیں۔

یہی حال مسیحی تاریخ کے آغاز میں وانغ۔ مانغ کا تھا اس نے بھی غلامی کے
نظریہ کو مہمل قرار دیتے ہوئے جاگیردارانہ نظام کو بیکار ثابت کر دیا تھا، جاگیرداروں
سے زمین چھین کر لوگوں پر تقسیم کی جا رہی تھیں، زمینوں کی خرید و فروخت حرام ہو گئی
تھی، کانیں اور بڑی صنعتیں قومی ملکیت کی شکل اختیار کر گئی تھیں اور معاشرہ
آج کے دور سے قریب تر ہو چکا تھا ـــــ تو کیا ان حالات کی بھی مارکسی تفسیر کی جا سکتی
ہے اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ فکریں بھاپ، دھواں، بجلی یا ایٹمی ذرائع پیداوار کا
نتیجہ تھیں؟ ہرگز نہیں ـــــ ماننا پڑے گا کہ صالح نظام کا تصور و ادراک
ذرائع پیداوار کی وسعت و ترقی کا مرہون منت نہیں ہے بلکہ دونوں کی راہیں
الگ الگ ہیں اور دونوں اپنے اپنے حالات کی بنیاد پر آگے بڑھتے ہیں۔

یہی حال مارکسیت کی ارتقائی حرکت کا ہے جس نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ہر
جدت صحت کی ضمانت ہے اور نئی فکر صحیح و صالح ہوا کرتی ہے اس لئے کہ یہ صرف
ایک خیالی بات ہے ورنہ تاریخ میں معاشروں کے انحطاط پذیر ہونے کی داستانیں
بکثرت موجود ہیں جن کا انکار ناممکن ہے۔

غیر مارکسی مفکرین

غیر مارکسی مفکرین کا خیال ہے کہ صالح نظام کا تصور و ادراک خود معاشرتی

تجربات سے حاصل ہوتا ہے۔ انسان جب ایک نظام کو معاشرہ پر منطبق کرتا ہے تو تھوڑے عرصے میں اس کی تمام خوبیاں اور خرابیاں اس کی نظروں کے سامنے آجاتی ہیں اور اسے یہ محسوس ہو جاتا ہے کہ اس کی فکر نے کہاں کہاں ٹھوکریں کھائی ہیں پھر وہ انھیں تجربات کی روشنی میں نئی فکر کرتا ہے اور ایک جدید نظام کی تشکیل ہوتی ہے جو خود بھی تجربہ گاہ حیات میں لایا جاتا ہے اور اس کے عیوب و محاسن کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ ٹھوکریں کھاتے کھاتے انسانی فکر اس منزل تک پہونچ جاتی ہے جس کا سوچا ہوا نظام یقیناً صالح نظام ہوتا ہے ——— اس بنیاد پر صالح نظام کا مسئلہ بالکل ایسا ہے کہ جیسے طبیعی دنیا میں یہ سوال اٹھایا جائے کہ مکان کو گرم رکھنے کا صالح ترین طریقہ کون سا ہے، ظاہر ہے کہ انسان جس زمانے میں پہاڑوں کے غار میں زندگی گذار رہا تھا اس وقت بھی اسے سردی محسوس ہوتی تھی اور وہ مکان کو گرم کرنے کی فکر میں مشغول تھا۔ اس وقت کے حالات نے اسے آگ کی ایجاد کی رہنمائی کی۔ پھر رفتہ رفتہ تجربات سے اس کا ذہن آگے بڑھتا رہا اور آج یہ طے ہو گیا کہ مکان گرم رکھنے کا بہترین طریقہ برقی آلات کا استعمال ہے، یہی حال T.B کے لئے بہترین دوا کی تلاش، تیل نکالنے کے لئے بہترین آلات کی تحقیق، حمل و نقل کے لئے تیز تر سواریوں کے انتظام کا تھا کہ پہلے انسان نے معمولی ذرائع سے کام لیا پھر اپنے متعدد تجربات سے فائدہ اٹھا کر جدید ترین آلات ایجاد کر دیئے ظاہر ہے کہ جو انسان اتنے ترقی یافتہ ذرائع زندگانی ایجاد کر سکتا ہے وہ اس بات پر بھی قادر ہے کہ مختلف سماجی تجربات کے بعد سماج کیلئے ایک صالح و صحیح نظام ایجاد کر دے جس کے زیر سایہ انسانیت امن و سکون کی زندگی گذار سکے۔

طبیعی اور سماجی تجربات کا فرق

یہ صحیح ہے کہ طبیعی تجربات کی طرح اجتماعی تجربات بھی انسان کی ذہنی صلاحیتوں میں بڑی حد تک اضافہ کر دیتے ہیں اور وہ پہلے سے بہتر سوچنے کے قابل ہو جاتا ہے لیکن مسئلہ کی گہرائیوں تک پہونچنے کے لئے ہمیں یہ دیکھنا پڑے گا کہ طبیعی تجربات اور سماجی تجربات میں زمین و آسمان کا فرق ہے T.B. کی دوا، حمل و نقل کا ذریعہ، تیل نکالنے کا آلہ یا اس قسم کے دیگر مسائل میں تجربہ اتنا دشوار نہیں ہے جتنا دشوار کسی سماجی نظام کا تجربہ ہے ——— دونوں تجربات میں الگ الگ صلاحیتوں کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ جس انسان میں ایک قسم کی صلاحیت پائی جاتی ہو اس میں دوسرے قسم کی صلاحیت ضرور ہو ——— طبیعی تجربات کی رفتار انتہائی تیز تر ہوتی ہے اور ہر تجربہ اس کی رفتار کو مزید تیز و تند بنا دیتا ہے لیکن اجتماعی تجربات کی رفتار انتہائی سست ہوتی ہے اور وہ کبھی بھی طبیعی تجربہ کا ساتھ نہیں دے پاتا ——— اس لئے بحث کو مکمل کرنے سے پہلے ہمیں ان تفرقوں پر غور کرنا پڑے گا جو ایک تجربے کو دوسرے سے الگ کرتے ہیں اور جن کی بنیاد پر یہ واضح ہو جاتا ہے کہ طبیعی تجربات اور ہیں اور سماجی تجربات اور ——— ان کی رفتار اور ہے اور ان کی رفتار اور ——— ان کی صلاحیت اور ہے اور ان کی صلاحیت اور۔ اور مختصر یہ کہ ان کی دنیا اور ہے اور ان کی دنیا اور ———

تجربات کے فرق

طبیعی اور اجتماعی تجربات کے فرق حسب ذیل دفعات میں بیان کئے جا سکتے ہیں۔

(۱) طبیعی تجربہ کو ایک تنہا انسان بھی انجام دے سکتا ہے۔ وہ لیبارٹی میں بیٹھ کر مختلف قسم کے اعمال انجام دے کر یہ دیکھ سکتا ہے کہ ان اعمال کے نتائج کیا ہوتے ہیں۔ اس تجربے سے کتنا فائدہ ہوتا ہے اور کتنا نقصان ــــ لیکن اجتماعی تجربہ ایک انسان کے بس کی بات نہیں ہے ــــ اجتماعی تجربے کے معنی یہ ہیں کہ ایک پورے نظام کو ایک پورے معاشرے پر منطبق کیا جائے اور پھر یہ دیکھا جائے کہ جاگیر دارانہ نظام یا سرمایہ دارانہ نظام تاریخ کے اس ایک معین دور میں کیا اثرات دکھلاتا ہے اور اس پورے معاشرہ کو ترقی یا تنزل کے کس راستے پر لے جاتا ہے ظاہر ہے کہ ان تمام حادثات میں ایک انسان تنہا شریک نہیں ہو سکتا۔ اسے ضرورت ہوگی کہ چند حادثات کا تجربہ کرنے کے بعد باقی کیلئے اپنے فکری رجحانات یا دوسروں کے تاریخی بیانات پر اعتماد کرے (دوسرے لفظوں میں یہ لیا جائے کہ کسی نظام کو آزمانے کے لئے یہ دیکھنا پڑتا ہے کہ اس نظام کا اثر غریب، امیر ــــ کسان، مالک ــــ مزدور، سرمایہ دار ــــ استاد، شاگرد ــــ مکان دار، کرایہ دار ــــ حمال، بقال، نداف، قصاب اور دیگر طبقات پر کیا پڑتا ہے اور ظاہر ہے کہ ایک آدمی ایک وقت میں یہ سب کچھ نہیں ہو سکتا۔ پھر یہ تو اس تجربہ کی بات ہے جو صرف اتنے دنوں قائم رہے جتنے دن تجربہ کرنے والا بقید حیات رہے حالانکہ اجتماعی تجربات کئی کئی صدی کے محتاج ہوتے ہیں اور ایک انسان کی عمر اس قدر وفا نہیں کر سکتی۔ اسلئے ماننا پڑیگا کہ اجتماعی تجربہ ایک دو آدمیوں کے بس کی بات نہیں ہے اسمیں ہر شخص دوسرے افراد نوع پر اعتماد کرنے کا محتاج ہے ــــ مترجم)

(۲) طبیعی تجربے کے سانچے سے ڈھلی ہوئی فکر اجتماعی تجربہ کی پیداوار سے کہیں زیادہ پاکیزہ اور صحیح ہوتی ہے جس کی بنیاد پر اجتماعی تجربہ کبھی طبیعی تجربہ کا ہم وزن نہیں قرار دیا جا سکتا اور یہ دونوں کا بڑا بنیادی فرق ہے جس پر توجہ دینا انتہائی

ضروری ہے ــــ اس فرق کا راز یہ ہے کہ طبیعی تجربہ میں انسان کی نظر صرف انکشاف پر ہوتی ہے اور عام طور سے اس کی کوئی غرض اس امر سے وابستہ نہیں ہوتی کہ حقیقت کا چہرہ مسخ کر دیا جائے یا نتیجہ کی شکل بدل دی جائے، وہ تو صرف یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ T.B کے جراثیم پر فلاں دوا ڈال دی جائے تو اس کا اثر کیا ہوگا اور وہ جراثیم کس حد تک زندہ رہ سکیں گے۔ اسے اس سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا کہ T.B میں مبتلا کون اور کس طبقہ کا انسان ہوگا۔ اس کے حالات کیا ہوں گے، میرے اس سے روابط و تعلقات کیسے ہیں ــــ لیکن اجتماعی تجربہ میں ایسا کچھ نہیں ہوتا وہاں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ تجربہ کرنیوالے کے ذاتی مصالح حقیقت کو پوشیدہ کر دینے پر مجبور کر دیتے ہیں اور وہ تجربہ کے ساتھ انصاف نہیں کر پاتا۔ مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ اگر کسی شخص کے ذاتی فوائد سرمایہ داری، ذخیرہ اندوزی یا سود خواری سے وابستہ ہیں تو اس سے کیا امید کی جاسکتی ہے کہ وہ اپنے تجربہ میں ان چیزوں کے سماجی نقصانات کی نشاندہی کرے گا اور ان کی مخالفت ہی کو صالح نظام کی شکل میں پیش کرے گا اس سے تو یہی امید کی جاسکتی ہے کہ وہ حقیقت کے چہرے کو مسخ کر دے اور نتیجہ کو خواہش کے سانچے میں ڈھال دے۔

یہی حال اس شخص کے تجربے کا ہوگا جس کے ذاتی مصالح ان چیزوں کی مخالفت سے وابستہ ہیں ظاہر ہے کہ وہ اپنے تجربے میں اپنے ذاتی رجحانات سے متاثر ہو کر ان کی مخالفت میں فیصلہ دے گا چاہے یہ چیزیں کتنی ہی زیادہ سودمند اور منفعت بخش کیوں نہ ہوں ــــ یہی وجہ ہے کہ اجتماعی تجربے کے کسی بھی نتیجے کو کامل وثوق و اطمینان کے ساتھ حقیقت کا درجہ نہیں دیا جاسکتا بلکہ اس کے لئے ضروری ہوگا کہ تجربہ کرنے والے کے ذاتی حالات پر بھی نظر رکھی جائے اور اس طرح تجربہ بے قیمت ہو کر رہ جائے گا۔

(۳) اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ انسان کسی وقت اپنے ذاتی رجحانات اور شخصی میلانات سے الگ بھی ہو سکتا ہے اور وہ صالح نظام کے ادراک میں غیر جانبداری سے کام لے سکتا ہے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ صالح نظام کے ادراک کے بعد جب اسکی تطبیق کا سوال اُٹھے گا تو اس وقت وہ شخص تطبیق میں کیسے مدد دے سکے گا جس کا مزاج اس صالح نظام سے ہم آہنگ نہیں ہے مثال کے طور پر یوں سمجھ لیجئے کہ آج کا مغربی انسان اگر اپنے بیشمار تجربات سے یہ فیصلہ بھی کر لے کہ عورت و مرد کا موجودہ اختلاط انسانی سماج کے لئے سم قاتل کی حیثیت رکھتا ہے تو کیا اس کا یہی فیصلہ اسے اس بات پر آمادہ کر دے گا کہ وہ اس اختلاط کے خاتمے کی کوشش کرے اور موجودہ صورت حال کو بدل ڈالے جبکہ اس اختلاط سے اس کے سیکڑوں جنسی منافع وابستہ ہیں، اسی سے تسکین نظر کا سامان بہم ہوتا ہے، اسی سے لمس کی لذت حاصل ہوتی ہے، اسی سے حُسن کی آنچ سے عشق کی سینک ہوتی ہے اور اس طرح سیکڑوں جنسی فوائد ہیں جن کا اندازہ وہی افراد کر سکتے ہیں جو اس اختلاط سے دوچار ہوں اور جن کی زندگی اسی جنسیت کی نذر ہو چکی ہو۔

مقصد یہ ہے کہ ہمیں صرف صالح نظام کے ادراک کی ضرورت نہیں ہے بلکہ ان فطری رجحانات کی ضرورت ہے جو انسان کو اس نظام پر عملدرآمد کرنے کے لئے مجبور کر سکیں اور جن کے بعد بغاوت کے جذبات پسپا اور پامال ہو جائیں۔

(۴) جس نظام کو کسی معاشرہ کا انسان ترتیب دیتا ہے اور اسے اس معاشرہ کے لئے صالح و سود مند تصور کرتا ہے وہ اس کی تربیت اور اس کی آفاقی ترقی کے لئے یقیناً ناکافی ہوا کرتا ہے اس لئے کہ انسانی تنظیم انسانی صلاحیت و استعداد کی آئینہ دار ہوا کرتی ہے اس کی پشت پر وہی ارادہ و عزم کام کرتا ہے جو اس مخصوص معاشرہ کی پیداوار ہوتا ہے لہٰذا اگر معاشرہ ضعیف الارادہ ہوا تو

اس معاشرہ کا ایجاد کیا ہوا نظام قوت ارادی کی تربیت کے لئے مفید نہیں ہو سکتا وہ تو ایسے ہی نظام کو ایجاد کرے گا جو اس کے ضعف ارادہ کا آئینہ دار اور اسکی فطری اور فکری کمزوری کا ترجمان ہو۔ مثال کے طور پر یوں سمجھ لیجئے کہ جو سماج شراب کی معمولی کشش کے مقابلہ میں اپنے ارادہ پر قابو نہیں پا سکتا، چھوٹی سی لذت کو ترک کرنے پر قادر نہیں ہے اس سماج سے کیا امید کی جا سکتی ہے کہ وہ ایسے سخت نظام کو رائج کر دے گا جو اس قسم کی تمام لذتوں پر پابندی عائد کرتا ہو اور نفس کو خواہشات سے آزادی دلا سکتا ہو؟ ـــ ہرگز نہیں ـــ خواہشات کی رو پر بہنے والے سماج سے قوت ارادی کی امید خیال و جنون کی حیثیت رکھتی ہے شراب سے چھٹکارا نہ پا سکنے والے انسان سے خواہشات کی مخالفت کی توقع انتہائی محل ہے چاہے وہ شراب کے نقصانات سے کسی حد تک واقفیت کیوں نہ رکھتا ہو۔ اور اس کا کتنا ہی احساس کیوں نہ کرتا ہو۔ اس لئے کہ نقصانات کا احساس اسی وقت شدید ہو گا جب شراب کا استعمال زیادہ مقدار میں ہو گا اور شراب کا زیادہ مقدار میں استعمال ہوتا ہی انسان کی قوت ارادی کے سلب ہو جانے کا باعث ہے لہٰذا شرابی کسی وقت بھی خواہشات کے طوفان کو روکنے پر قادر نہیں ہو سکتا اور نہ خواہش کے مخالف نظام کو رائج کر سکتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ انسانی تمدن کسی وقت بھی ایسے قانون کو نافذ نہیں کر سکا جو انسان کو خواہشات کی غلامی سے آزادی دلا کر اسے صحیح انسانیت کی سطح تک پہونچا سکتا۔ آج کے انتہائی ترقی یافتہ متمدن ملک امریکہ ہی کو دیکھ لیجئے کہ وہ حرمت شراب کے قانون کو نافذ کرنے سے بہر طور عاجز ہو چکا ہے اور اس کا سبب بھی یہی ہے کہ خواہش پرست سماج کبھی خواہش کے خلاف نظام برداشت نہیں کر سکتا اور انسانیت کو اس قعر مذلت سے نجات نہیں دلا سکتا ـــ حالانکہ

اسی کے برخلاف اسلام کی روحانی تربیت تھی جس نے تھوڑے ہی عرصے میں ایک پورے معاشرہ سے شراب جیسی تمام لعنتوں کو دور کر دیا اور انسان کے اندر قوت ارادی کو انتہائی مستحکم بنا دیا۔

طبیعی اور اجتماعی تجربات کا فرق واضح کرنے کے بعد ایک دوسرا سوال بھی پیدا ہوتا ہے جس کا جواب دینا بھی تکمیل بحث کے لئے انتہائی ضروری ہے، سوال یہ ہے کہ معاشرتی زندگی کی تنظیم اور اجتماعی حیات کی تشکیل کے لئے طبیعی علم سے کس حد تک فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے، فیزکس اور کیمسٹری کے تازہ ترین تحقیقات اجتماعی نظام کے ادراک میں کہاں تک مددگار ثابت ہو سکتے ہیں؟ یا دوسرے لفظوں میں یہ کہا جائے کہ کیا طبیعی اور تجرباتی علوم کی ترقی صالح نظام کے ادراک کے مسئلے میں انسانی تاریخ کے مطالعہ سے بے نیاز بنا سکتی ہے؟ اور کیا یہ ممکن ہے کہ ماضی قدیم کے حالات کو تاریخ کے آئینہ میں دور سے دیکھنے کے بجائے فیزکس اور کیمسٹری کے تازہ ترین انکشافات کی روشنی میں اجتماعی نظام قائم کر لیا جائے؟

بعض خوش فہم لوگوں کا خیال ہے کہ مغرب کی یہ روز افزوں ترقی یقیناً انسان میں اتنی صلاحیت پیدا کر سکتی ہے کہ وہ اپنی اجتماعی زندگی کی تنظیم انھیں ترقیات کی روشنی میں کر لے اور کسی گذشتہ دور کے مطالعے کی ضرورت نہ پڑے اس لئے کہ اجتماعی نظام اسی نظام کا نام ہے جو انسانوں کی ضروریات کو بہتر سے بہتر طریقے سے پورا کر سکے اور انسانی ضروریات واقعی حیثیت رکھتے ہیں جن کا صحیح اندازہ جدید علوم کی روشنی کیا جا سکتا ہے، ان انکشافات سے یہ پتہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان ضروریات کو پورا کرنے کے لئے کن اعمال کی ضرورت ہے اور ان اعمال کے اثرات کیا ہیں؟ اور جب یہ سب کچھ ممکن ہے انسانی ضروریات قیاس میں

آسکتی ہیں، انھیں پورے کرنے والے افعال بھی محدود حیثیت رکھتے ہیں، ان افعال کے اثرات بھی حساب میں آنے کے قابل ہیں تو یہ کیونکر ممکن نہیں ہے کہ چند اشخاص کا تجربہ کرکے انسان کے تمام طبیعی، حیاتیاتی، عوامل کا پتہ لگا لیا جائے، ان کے کاموں کا اندازہ کرلیا جائے اور ان کی روشنی میں ایک ایسا نظام مرتب کرلیا جائے جو افراد کی عقلی اور فکری صلاحیتوں کی تربیت کر سکے۔

بعض لوگ تو اور بھی آگے بڑھ گئے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ یہ بات ممکن ہی نہیں ہے بلکہ یورپ کے جدید تمدن میں واقع بھی ہوئی ہے۔ اس نے مذہب، اخلاق اور اس قسم کے تمام فکری اور اجتماعی مقولات کو ترک کرنے کے بعد اپنی زندگی کو علمی انکشافات کی بنیاد پر منظم کرنے کی کوشش کی ہے اور انسانیت کیلئے ایک راستہ تلاش کیا ہے جس سے آسمانوں کے دروازے کھل گئے ہیں اور زمین خزانے اُگلنے لگی ہے۔

اس مقام پر ہمارا فرض ہو جاتا ہے کہ اصل مسئلہ کو حل کرنے سے پہلے ان خوش اعتقادیوں پر ایک نظر کرتے جائیں اور یہ واضح کردیں کہ یورپ کے اس جدید تمدن کو علمی انکشافات سے کوئی واسطہ نہیں ہے، ان کے جملہ قوانین و قواعد نظریاتی ہیں جن کی بنیاد فلسفی اصول اور مخصوص عقائد پر ہے انھیں فزکس کے تجربات اور کیمسٹری کے تجزیہ سے کوئی واسطہ نہیں ہے اس کی پشت پر نہ انسانی ضروریات کا حساب لگایا گیا ہے اور نہ ان ضروریات کو پورا کرنے والے اعمال کا ـــــ ان کی انقلابی تاریخ کا بغور مطالعہ کرنے والا جانتا ہے کہ مادی میدانوں میں ان کا عام نظریہ اجتماعی اور تنظیمی میدان کے عمومی خیال سے بالکل الگ ہے وہ مادی میدان میں تجربات و مشاہدات کے قائل ہیں ـــــ پانی کی ترکیب، ہوا کا وزن، جذب کی صلاحیت، ایٹم کا تجزیہ یہ تمام باتیں انھوں نے تجربے سے سیکھی ہیں لیکن

مادیت نے اور بھی زور کیا، جنگ و جدل، قید و بند، استعمار و استحصال کوئی ذریعہ ایسا نہ تھا جسے خواہشات کی تکمیل اور تمناؤں کی بر آری کے لئے اختیار نہ کیا گیا ہو۔
اب آپ ہی انصاف کریں کہ ایک خالص مادی نظام کا انجام اسکے سوا اور کیا ہو سکتا تھا اور اخلاق و روحانیت کے منکر مذہب سے اور کیا توقع کی جا سکتی تھی؟

اشتراکیت و اشتمالیت

اشتراکیت میں یوں تو بہت سے مذاہب پائے جاتے ہیں لیکن مشہور ترین مذہب مارکس کا ہے جسکی بنیاد تاریخی مادیت اور مادی جدلیت پر ہے، مادی جدلیت کا مفہوم یہ ہے کہ تاریخ کے ارتقاء اور حیات کی نشوونما کی تفسیر جدلیاتی نظام سے کی جائے اور دنیا کے ہر دور حیات کو دو ظاہر و باطن طاقتوں کے ٹکراؤ کا نتیجہ قرار دیا جائے، مارکس ازم میں جدلیت اس قدر مقبول اور ٹھوس حقیقت بن گئی کہ اسے تاریخ، سماج، اقتصاد سب ہی پر منطبق کر دیا گیا اور یہ نظریہ کائنات کی تفسیر کا فلسفہ، معاشیات کے میدان میں نظام اور سیاست کی منزل میں ایک نشان راہ بن گیا، انسان فکر و نظر کے اعتبار سے ایک مخصوص سانچے میں ڈھل گیا اور کائنات صرف طاقتوں کا تصادم رہ گئی اور بس۔

ظاہر ہے کہ مادیت یا جدلیت کوئی مارکس کی ایجاد نہیں ہے بلکہ مادیت مارکس سے ہزارہا سال پہلے سے فلسفہ کے میدان میں کارفرما رہی ہے کبھی کھل کر اور کبھی پوشیدہ طور پر —— اور جدلیت انسانی فکر میں ایک مبہم خاکے کی حیثیت سے وجود پذیر رہی ہے۔ یہاں تک کہ ہیگل کا دور آیا اور اس نے اس کا پورا نظام مرتب کر دیا — مارکس کا کام صرف یہ تھا کہ اس نے اس جدلیت کو زندگی کے ہر شعبہ پر حاوی کر دیا

اور کائنات کے ہر میدان میں جگہ دلوادی ــــ مارکس کی تحقیقات کا خلاصہ یہ ہے!

۱۔ مارکس نے پوری تاریخ کو مادیت کا جامہ پہنا کر اس کے ہر انقلاب کو جدلیت کے سانچے میں ڈھال دیا۔

۲۔ مارکس کا خیال ہے کہ تاریخ کے ہر موڑ پر سرمایہ اور زائد قیمت میں ٹکراؤ ہوتا رہا ہے جسے سرمایہ دار مزدور کی محنت میں سے چرا لیا کرتا تھا۔

انھیں دونوں بنیادوں پر مارکس نے یہ طے کر دیا کہ سرمایہ دار معاشرہ کو عالم وجود سے فنا ہونا چاہیئے اور ایک ایسا اشتراکی و اشتمالی سماج پیدا ہونا چاہیئے جہاں سرمایہ و مزدور کا جھگڑا ہی ختم ہو جائے۔ نہ سرمایہ دار مزدور کے ثمرۂ محنت سے چوری کرے اور نہ مزدور اس کے خلاف بغاوت کرے۔

معاشرہ مارکس کی نظر میں ایک میدان جنگ ہے جہاں دو طاقتیں مصروف کارزار رہتی ہیں، معاشرہ کا ہر منظر اور یہاں کی ہر حالت مادی تقاضوں کا نتیجہ اور خالص مادی ہوتی ہے لیکن اس کے باوجود اپنے اندر اپنے مخالف عناصر بھی رکھتی ہے جن کی وجہ سے معاشرہ کے اندر اندر ایک داخلی جنگ جاری رہتی ہے اور اس جنگ کے دوران مخالف طاقتیں برسر اقتدار طاقتوں کو کمزور بناتی رہتی ہیں یہاں تک کہ مخالف طاقتوں کا زور بڑھ جاتا ہے اور برسر اقتدار طاقتیں خود بخود میدان سے ہٹ جاتی ہیں جس کا نام انقلاب رکھا جاتا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ایک ایسا معاشرہ ایجاد کیا جائے جہاں یہ جھگڑے نہ ہوں سارا سماج ایک طبقہ پر مشتمل ہو اور ہر شخص اسی طبقہ کی فلاح و بہبود کے بارے میں غور و فکر کرے۔ اتحاد عام اور سلامتی ہمہ گیر ہو ــــ سرمایہ داری کے مفاسد کا خاتمہ ہو اور طبقاتی نظام کا جنازہ نکل جائے۔

ظاہر ہے کہ طبقاتی نظام کا جھگڑا مالک و مزدور کی بنیاد پر پیدا ہوا تھا

اس لئے ہمارا پہلا قدم یہ ہونا چاہیئے کہ سماج سے مالک و مزدور کی تقسیم کا خاتمہ کریں اور یہ خاتمہ اس وقت تک ناممکن ہے جب تک ملکیت کا تصور باقی ہے ہر شخص کسی چیز کو اپنی ملکیت سمجھتا ہے اور اسے اپنے سے زیادہ مربوط خیال کرتا ہے۔

یہاں تک آنے کے بعد اشتراکیت اور اشتمالیت کی راہیں الگ الگ ہو جاتی ہیں اور دونوں کے درمیان چند حد فاصل پیدا ہو جاتے ہیں۔

۱۔ اشتمالیت کی بنیاد یہ ہے کہ ملکیت کا یکسر خاتمہ کر دیا جائے۔ کوئی شخص چھوٹی بڑی چیز کا مالک نہ تصور کیا جائے۔ ساری دولت حکومت کے حوالے ہو اور وہ سماج کی وکیل بن کر اس کا انتظام کرے اور اس کے اضافہ کی فکریں کرے اس لئے کہ انفرادی ملکیت کا تصور سرمایہ دارانہ نظام پیدا کرتا ہے۔ جو سماج دو حصوں پر تقسیم کر کے اسے ایک میدان جنگ بنا دیتا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ کسی شخص کو سرمایہ بڑھانے کی مہلت نہ دی جائے کہ وہ مزدوروں کا خون چوس سکے اور سماج کو اپنا غلام بنا کر رکھ سکے۔

۲۔ اشتمالیت کا ایک قانون یہ ہے کہ حکومت پورے سرمائے کو لوگوں کی ضروریات کے مطابق تقسیم کرے، "ہر شخص سے بقدر ہمت و طاقت کام لیا جائے اور ہر شخص کو بقدر ضرورت مال دیا جائے" اس لئے کہ فطری طور پر ہر شخص کچھ ضروریات رکھتا ہے جنھیں پورا کرنے کے لئے اسباب کی ضرورت ہوتی ہے اور جب یہ اسباب حکومت کے ہاتھوں میں رہیں گے تو ہر شخص اس بنیاد پر محنت کرے گا کہ اس طرح حکومت کے سرمائے میں اضافہ ہوگا اور وہ اضافہ پلٹ کر میری طرف آئے گا۔

۳۔ حکومت کو چاہیئے کہ معاشیات کے لئے ایک ایسا دستور مرتب کرے جس میں اس بات پر خاص توجہ دی گئی ہو کہ ملک کی پیداوار کیا، کتنی اور کیسی ہے

اور پھر سماج کے ضروریات کیا ہیں؟ تاکہ دونوں کے درمیان ہم آہنگی پیدا کی
اور معاشرہ میں وہ امراض نہ پیدا ہو سکیں جو سرمایہ داری کے دور میں پیدا
ہو گئے تھے جب ہر شخص آزاد تھا اور ہر ایک کا مقصد عمل اپنا فائدہ تھا اور بس

اشتمالیت سے انحراف

اشتمالیت کے وہ رہنما جنھوں نے اس نظام کا اعلان کیا تھا جب یہ دیکھ
چکے کہ ایسا کوئی نظام اس دنیا میں قابل عمل نہیں ہے اور نہ معاشرہ اسے
برداشت کر سکتا ہے، ابھی انسان کو بدلنے کی ضرورت ہے اس کے اغراض
جذبات، خواہشات پر پابندی لگانے کی ضرورت ہے، اسے گویا از سر نو پیدا
کرنے کی ضرورت ہے جہاں ذاتی منفعت کا تصور ختم ہو جائے اور صرف اجتماعی
فائدہ کا تصور باقی رہے۔ جو انسان سوچے وہ اجتماعی مفاد کے لئے اور جو قدم
اٹھائے وہ سماجی مصلحت کے واسطے، یہی مجبوری تھی جس نے اشتمالیت کے
بجائے اشتراکیت کو میدان میں جگہ دلائی جس کا کام اس ماحول کا تیار کرنا
اور ان حالات کا ساز گار بنانا تھا جن میں اشتمالیت اپنا فریضہ انجام دے
سکے اور دنیا اجتماعی زندگی بسر کر سکے، اسی لئے اس میں اشتمالیت کے برخلاف
کی ابتدائی شکل پائی جاتی ہے، وہاں شخصی ملکیت کے یکسر خاتمے کا تصور نہیں
یہاں افراد کو بڑی بڑی صنعتوں، خارجی تجارتوں اور داخلی بڑے کاروبار سے
روکا گیا ہے اور چھوٹے چھوٹے کاروبار کی اجازت دے دی گئی ہے اسلئے
وہ نظام انسان کی فطرت سے متصادم ہو گیا تھا اور انسان اسے قبول کرنے
کے لئے تیار نہ تھا۔ لوگ کام میں سستی کرنے لگے تھے اور ہر ایک ذہن میں یہی ایک
خیال تھا کہ نتیجہ بہر حال برابر کا ملنا ہے چاہے محنت کتنی زیادہ کیوں نہ کی جائے

اس لئے صرف دوسروں کی راحت کے لئے اپنی جان دینے سے کیا فائدہ؟ اور یہ بات کسی حد تک صحیح بھی تھی اس لئے کہ وہ لوگ ایک ایسے معاشرے میں زندگی بسر کر رہے تھے جو خالص مادی تھا اور جس میں اخلاقی اقدار کا کوئی وجود نہ تھا اور ظاہر ہے کہ مادیت خود غرضی پر آمادہ کرتی ہے اسے سماج کی خدمت سے کیا تعلق ہے؟

یہی وہ حالات تھے جنھوں نے دوسری بنیادیں بھی کم کرائیں اور نشاط عمل کے باقی رکھنے کے لئے مزدوروں کی اجرتوں میں فرق پیدا کیا گیا اور اس کی توجیہ یہ کی گئی کہ یہ تفرقہ کسی طبقاتی نظام کے اعتراف کے لئے نہیں ہے بلکہ یہ ایک تمہیدی قدم ہے اس ماحول کو سازگار بنانے کے لئے جس میں غیر طبقاتی نظام رائج کیا جا سکے اور یہی وجہ ہے کہ اس کے قوانین میں روزانہ تغیرات ہوتے چلے جا رہے ہیں تاکہ رفتہ رفتہ ذہنوں کو ہموار کیا جا سکے۔ یہ اور بات ہے کہ اب تک کے طولانی عرصے میں بھی یہ مقصد پورا نہ ہو سکا اور سود کا رواج اشتراکی ممالک میں باقی ہے جو سرمایہ دار نظام کے باقی رکھنے کے لئے انفرادی ملکیت سے کہیں زیادہ مفید اور اشتراکیت کے لئے نقصان دہ ہے۔

میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ اشتمالیت کے نمائندوں کو اپنے عقیدے سے کوئی خلوص نہیں تھا یا انھوں نے اس کی ترویج میں کوئی کوتاہی کی ہے بلکہ میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ یہ بیچارے مقام عمل میں کچھ ایسے حقائق سے ٹکرا گئے جن کا مٹانا ان کے لئے ناممکن تھا اس لئے انھوں نے اپنے نظام میں ترمیم ہی زیادہ مناسب خیال کی اور ترمیم کو تمہیدی اقدام کا نام دیدیا تاکہ اس مستقبل سے آس لگا سکیں جس کے لئے یہ سارے ہنگامے برپا کئے ہیں۔

سیاسی اعتبار سے اشتمالیت کا عقیدہ یہ تھا کہ حکومت کا یکسر خاتمہ کر دیا جائے۔ ہر انسان فکری طور پر اجتماعی عقل کا حامل ہو۔ اس کا ذہن اجتماعی مفاد کے

سانچے میں ڈھلا ہو وہ جب سوچے تو اجتماعی مفاد کے لئے۔ اور عمل کرے تو اسی فائدے کے لئے ــــــ لیکن جب تک یہ معجزہ رونما نہ ہو اور سارا عالم ایک طبقہ میں نہ آجائے اس وقت تک کے لئے حکومت کا وجود ضروری ہے۔ اور ضرورت اس بات کی بھی ہے کہ یہ حکومت مزدوروں کی ہو جس کا انداز مزدوروں کے حق میں جمہوری ہو اور باقی لوگوں کے حق میں آمرانہ ــــــ مزدور آمریت کی ضرورت اس لئے بھی ہے کہ اس طرح میدان مزدوروں ہی کے ہاتھ میں رہے گا۔ حکومت کے سارے کام انھیں کی منفعت و مصلحت کیلئے ہونگے اور سرمایہ داری از سر نو منظر عام پر نہ آسکے گی

حقیقت یہ ہے کہ اشتراکیت یا اشتمالیت کو سرمایہ داری پر ایک امتیاز ضرور حاصل ہے اور وہ یہ کہ سرمایہ داری مادی ہونے کے باوجود کوئی مادی فکر یا منظم فلسفہ نہیں رکھتی لیکن اشتراکیت و اشتمالیت کا ایک بنیادی فلسفہ ہے جس پر اسکے اصول قائم ہوئے ہیں اور جس کی بنیاد پر اس کا سارا نظام مرتب ہوا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس مادیت میں نہ مبدر کی جگہ ہے اور نہ معاد کی ــــــ اخلاقیات کا کوئی درجہ ہے نہ روحانیت کا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس نظام کا تجزیہ بھی فلسفہ ہی کی روشنی میں کیا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ اشتراکیت کا نظریہ حیات و کائنات کے بارے میں کہاں تک صحیح ہے تاکہ اسکی روشنی میں مرتب ہونے والے نظام کے بارے میں بھی کوئی علمی فیصلہ کیا جاسکے۔

اشتراکیت کے بارے میں فلسفیانہ بحث سے پہلے ایک نظر میں اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے کہ اشتراکیت پر مکمل طریقے سے اجتماعیت کی چھاپ ہے۔ یہاں فرد کی کسی حیثیت کا اعتراف نہیں کیا جاتا بلکہ اسے سماجی فائدے کا ایک آلہ و وسیلہ فرض کیا جاتا ہے اور بس! بعینہ سرمایہ دارانہ نظام کی طرح کہ وہاں اجتماع کا کوئی درجہ نہیں ہے مکمل آزادی افراد کو حاصل ہے۔ سماج کو انھیں افراد کا تابع ہونا چاہیئے

اور انھیں کے مصالح کے لئے کام کرنا چاہیئے. گویا اجتماع و انفراد دو عظیم طاقتیں ہیں جو ہمیشہ میدان معاشرہ میں مصروف کارزار رہتی ہیں. سرمایہ داری کے نظام میں فتح افراد کی ہوتی ہے اور سماج کی اکثریت ذلت و رسوائی، مصیبت و زبوں حالی کی زندگی گذارتی ہے اور اشتراکی نظام میں فتح معاشرہ کی ہوتی ہے. جہاں افراد اپنی فطری آزادی کھو بیٹھتے ہیں ان کے اختیارات سلب ہو جاتے ہیں ان کا وجود بے ارزش ہو جاتا ہے اور وہ صرف ایک آلے کی حیثیت سے رہ جاتے ہیں

اشتمالیت کے مواخذات

حقیقت یہ ہے کہ اشتمالیت نے شخصی ملکیت کا خاتمہ کر کے سرمایہ داری کے بہت سے مفاسد کا قلع قمع کر دیا ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ خود اس قانون کے اندر کچھ ایسی فطری کمزوریاں موجود ہیں جو اس علاج کو بے ارزش بنا دیتی ہیں اور نگاہ انصاف میں اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں رہ جاتی. یہ ایک ایسا دشوار گذار راستہ ہے جس سے چلنے کے لئے نفس اور نفسانی تقاضوں سے علیحدگی ضروری ہے اور یہ ایک انسان کے بس کی بات نہیں ہے، دوسری طرف اس علاج میں مرض کی صحیح تشخیص نہیں کی گئی اس لئے مرض کا مکمل خاتمہ ناممکن ہے.

اشتمالیت کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ اس نے انسانی حریت و آزادی کا قلع قمع کر کے شخصی ملکیت کی جگہ اجتماعی ملکیت کو رکھنا چاہا ہے جو کم از کم موجودہ دور تک خلاف فطرت انسان ہے اس کے بعد انسانی فطرت میں تغیر پیدا ہو جائے تو اس کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے، آج تک کا انسان تو ہمیشہ ذاتی مفاد کے بارے ہی میں سوچتا ہے وہ اس کائنات کو اپنی ذات کے نقطہ نگاہ سے دیکھتا ہے اور اشتمالیت اسے "نشاۃ ثانیہ" دیکر اسے اجتماعی سانچے میں ڈھالنا چاہتی تھی،

جہاں اس کی انفرادیت کا یکسر خاتمہ ہو جائے، ظاہر ہے کہ ایسے ذہنی و عقلی، فطری و طبیعی انقلاب کے لئے ایک ایسی قوت کی ضرورت ہے جو معاشرہ کی باگ ڈور کو اپنے آہنی ہاتھوں سے سنبھالے جہاں ہر آواز دبائی جائے اور ہر سانس کو بند کر دیا جائے، نشر و اشاعت کے وسائل پر قبضہ کر لیا جائے اور انسانیت سوز سزائیں دی جائیں تاکہ انسان ایک مخصوص سانچے میں ڈھل سکے اور اس کے دل سے بغاوت کے جذبات محو ہو جائیں۔

یہ بات تنہا اشتمالیت کے لئے نہیں ہے بلکہ ہر وہ نظام جو ذہنی طور پر ماحول کے سازگار ہونے سے پہلے معاشرہ پر بار کیا جائے گا اس کا یہی انجام ہوگا اور اس کی اشاعت کے لئے یہی ذرائع استعمال کرنا پڑیں گے ــــ ہاں جب انسان کی فکر اجتماعی ہو جائے گی، اس کی عقل اجتماعیت کے سانچے میں ڈھل جائے گی، اس کے نفسانی خواہشات اور انفرادی جذبات محو ہو جائیں گے تو ایسے نظام کا قائم کرنا انتہائی آسان ہو جائے گا۔ ــــ لیکن کھلی ہوئی بات ہے کہ مادیت پرست دنیا میں ایسے انقلاب کا رونما ہونا ناممکن ہے۔ وہاں جنت دنیا میں نہیں بنائی جا سکتی اور انسان سازی کا کارخانہ مادی سرزمین پر نہیں کھل سکتا۔ یہ اور بات ہے کہ اشتمالیت کے رہنما ہم سے اس بات کا وعدہ کرتے ہیں اور وہ اپنے اندر ایسے انسان کے پیدا کرنے کی طاقت بھی رکھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اجتماعی انسان کی تخلیق اس ماحول میں بھی ممکن ہے جہاں اخلاقی اقدار کا انکار کر دیا گیا ہو اور انفرادی اغراض و جذبات کا وہاں بھی خاتمہ ہو سکتا ہے جہاں مادیت کی کارفرمائی اور دنیاوی لذت کی حکمرانی ہو۔ حالانکہ موجودہ صورت حال میں یہ بات اسی وقت ممکن ہو سکتی ہے جب ایک پوری جماعت اس نظریہ کی حمایت پر کمربستہ ہو جائے، لوگوں پر سختی کرے انھیں اسی نظریہ کا جبری طور پر پابند بنائے،

ان کے خیالات میں تبدیلی پیدا کرے اور ان کے نفس سے انفرادیت کے سارے جذبات سلب کرے ـــــ ظاہر ہے کہ ایسے حالات میں انسان کو معاشی اعتبار سے سکون ضرور مل جائے گا اور اس کے ضروریات زندگی ضرور پورے ہو جائیں گے اس لئے کہ حکومت کے پاس ضرورت سے زیادہ سرمایہ محفوظ ہو چکا ہوگا۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انسان کی فطرت اور اس کے جذبات کا کیا حشر ہوگا، اس کی آزادی کس ٹھکانے لگے گی۔ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ ایک ایسا نظام اختیار کر لیا جائے جہاں معاشی اعتبار سے یہ ساری سہولیتں بھی فراہم ہوں اور انسان کی فطری آزادی بھی محفوظ رہے۔ اجتماعی حالات بھی سدھر جائیں اور حکومت کی بھٹی میں انفرادیت کو پگھلانا بھی نہ پڑے؟ اور سچ تو یہ ہے کہ جس نظام میں انسان کو معاشی آزادی میسّر نہ ہو، غذائی صورتحال تک چند آدمیوں کے خیال سے وابستہ کر دی جائے وہاں کسی دوسرے قسم کی آزادی کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے ـــــ؟

مارکسیت کے بعض پرستاروں کا کہنا ہے کہ انسان کی فطری ضرورت بہترین غذا اور عمدہ اسباب معیشت و زندگانی ہیں اور جب کسی بھی نظام میں یہ باتیں میسّر ہو جائیں تو انفرادی آزادی کی کیا ضرورت ہے اور اپنے افکار و خیالات کا اظہار ہی کیا ضروری ہے، کیا ہر عقیدہ کا اظہار اور ہر خیال کا اعلان بھی انسان کی کوئی فطری ضرورت ہے اور کیا بغیر تنقید و اعتراض انسان زندہ نہیں رہ سکتا؟

بظاہر یہ بات بڑی خوبصورت سی ہے لیکن افسوس یہ ہے کہ ان لوگوں نے اپنے سامنے صرف سرمایہ داری کا نظام رکھا ہے اور اسی پر یہ بنیاد قائم کی ہے کہ شخصی ملکیت سماج کے لئے انتہائی ضرر رساں اور نقصان دہ ہوتی ہے اس لئے اس پر

باقاعدہ پابندی عائد کر کے حکومتی پیمانے پر عوام کے آب و دانہ کا انتظام کیا جائے
ان لوگوں نے کسی اور نظریہ و مذہب پر نظر ہی نہیں ڈالی ورنہ یہ سوچتے کی انسانی فطرت
میں کسی بھی جذبے کی قربانی اس وقت تک جائز نہیں ہے جب تک کہ اس قربانی کے
بغیر سماج و معاشرہ کی اصلاح ناممکن نہ ہو جائے، انسانیت کے سامنے دو عظیم
مسائل ہیں ایک طرف اس کی حریت ہے جو اس کا فطری اور معنوی حق ہے اور ایک
طرف مادی ضرورت ہے جو اس کا معاشی اور سماجی لازمہ ہے، ضرورت ایک ایسے
نظام کی ہے جو ان دونوں پہلوؤں کا جامع اور دونوں گوشوں پر حاوی ہو۔

انسانیت کے لئے سرمایہ داری اور اشتراکیت دونوں ایک جیسے ہیں۔
سرمایہ داری میں چند لوگ عوام کی طاقت کو نچوڑ لیتے ہیں، انھیں خوشگوار زندگی
مناسب اجرت اور پر سکون ماحول نصیب نہیں ہوتا اور اشتراکیت میں ان
تمام باتوں کے باوجود انسان ہمہ وقت تحدید منزلوں پر رہتا ہے، ہر عمل کا محاسبہ
ہوتا ہے، ہر وقت قید و بند، قتل و دربدری کا اندیشہ دامن گیر رہتا ہے اور
زندگی ایک خوفزدہ، مرعوب، مدہوش اور پریشان حال انسان کی زندگی بن جاتی
ہے ـــــ جبکہ ایک تیسرا نظام ایسا بھی ممکن ہے جہاں انسان معاش کے اعتبار
سے مطمئن اور جذبات و عواطف کے اعتبار سے پر سکون رہتا ہو لیکن سوال یہ ہے
کہ وہ نظام کیا ہو اور یہ خواب کس طرح شرمندۂ تعبیر بن سکے ؟

ظاہر ہے کہ اشتمالیت ایسا نظام نہیں پیش کر سکتی اسلئے کہ اس میں سرمایہ داری
کے مفاسد کا کسی حد تک علاج ضرور ہے لیکن اس کے بعد صرف جذباتی نعرے ہیں
اور بس۔ نہ مرض کی صحیح تشخیص ہے اور نہ علاج کا معقول انتظام، انفرادی ملکیت
جسے تمام فسادات کا سرچشمہ فرض کیا گیا ہے وہ تنہا ان فسادات کی اصل نہیں ہے
وہ نہ جدید آلات و وسائل کی بنیاد پر لاکھوں مزدوروں کو بیکار و معطل بنا دیتی